گہری جڑیں

ہندی کہانیاں

ڈاکٹر نیرجا مادھو

مترجم
ڈاکٹر غلام نبی مومن

گہری جڑیں

﴿ہندی کہانیاں﴾

مصنفہ

ڈاکٹر نیرجا مادھو

مترجم

ڈاکٹر غلام نبی مومن

حرفِ چند

جدید ہندی کہانی کی اُٹھان میں ڈاکٹر نیرجا مادھو کا نام بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اپنی تخلیقات کے لیے انھیں کئی انعامات ملے اور وہ مختلف اعزازات سے نوازی گئیں۔ انھوں نے اپنے آس پاس کی سماجی اور معاشرتی زندگی کو سمجھا، جانچا اور پرکھا، ان کے مسائل کا گہرا مطالعہ کیا اور ان ہی مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا۔ ان کی کہانیاں انسانی درد وغم اور باطنی کشمکش کا مؤثر اظہار ہیں۔ ان کی بیشتر کہانیوں میں ایسی لاکھوں، کروڑوں عورتوں کے جذبات کو علامتی انداز میں بیان کیا گیا ہے جو انصاف کے لیے خوف و دہشت اور جابرانہ قوتوں کا سامنا کررہی ہیں۔

نیرجا جی کی کہانیاں عورتوں کے دلگداز احساسات کی ترجمان ہیں۔ انھوں نے چند عورتوں کی انفرادی بغاوت کو اجتماعی شکل دینے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ شمالی ہند کے سماج میں نچلے طبقے کی سماجی و معاشی حالات سے نبرآزما عورت کی تصویر انتہائی بھیانک ہے۔ مصنف نے عورتوں کے ذہنی استحصال کو بھی موضوع بنایا ہے۔ لیکن یہ بھی بتایا ہے کہ آج کی عورت اپنے دُکھوں اور تکلیفوں سے نجات پانے کی کوشش کررہی ہے۔

نیرجا مادھو اپنے کرداروں کو انتہائی فنکارانہ مہارت سے پیش کرتی ہیں۔ ان کا اسلوب سہل اور فطری ہے اور مختلف حالات میں اُلجھی ہوئی انسانی زندگی کے انسانی پہلو کا عکاس بھی ہے۔ موصوفہ کی ہر کہانی اپنے موضوع کے اعتبار سے انفرادی نوعیت کی حامل ہے۔

ڈاکٹر غلام نبی مومن اُردو ادیبوں میں ایک اہم نام ہے۔ آپ کی ترجمہ شدہ کہانیوں پر طبع زاد ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے قارئین کو لفظوں کے گورکھ دھندے میں اُلجھانے کی بجائے سہل انداز میں اپنی بات کہہ دی ہے۔

ڈاکٹر مومن نجی زندگی میں بھی عورتوں کا بہت احترام کرتے ہیں۔ اس سے ان کی عظمت ظاہر ہوتی ہے۔ انھوں نے ترجمے کے لیے ایسی ہی کہانیوں کا انتخاب کیا ہے جن میں عورتوں کو دبانے، کچلنے اور ان کا استحصال کرنے والوں کے خلاف آواز اُٹھائی گئی ہے جس کے لیے وہ یقیناً مبارکباد کے مستحق ہیں۔

اُمید ہے مومن صاحب کی پیش قدمی اسی طرح جاری رہے گی اور انھیں ادب میں نمایاں مقام دلائے گی۔

ڈاکٹر الکا پوتدار
ہندی افسر، بال بھارتی، پونہ

پنڈت جی نے گلاب دانی سے تین بار پانی چھڑک کر اوم پوترم پوترم کر دیا ہو۔

''ہوں .... ہوں ...... بھول جاتی ہیں ہم کہنا۔ عادت پڑ گئی ہے سب کو میم صاحب کہنے کی۔ اس سے پہلے ہم جن کے یہاں کام کرتے تھے وہ تو ناراض ہو جاتی تھیں کہ ای رشتے داری بنا رہی ہو۔ میم صاحب کہا کرو۔'' پرت پِیا نے جھینپ کر ہنستے ہوئے سر نیچے جھکا لیا۔

''ہاں تو بتاؤ، کیا فرق ہے سگائی اور بیاہ میں؟''

مکتا نے دوبارہ سوال کیا۔ اس بار یومِ خواتین کے موقع پر مجلس بیداریٔ خواتین کے زیرِ اہتمام منعقد ہونے والے کل ہند سطح کے مذاکرے میں اسے تقریر کرنی تھی اور اب صرف دو دن باقی تھے۔ وہ عورتوں سے متعلق چونکانے والے کچھ حقائق تلاش کر رہی تھی تا کہ حسبِ معمول اس کی تقریر کا لوگوں پر زبردست اثر پڑے۔ اپنے اس ہنر کی وجہ سے وہ نہ صرف اپنے بلکہ دوسرے شہروں میں بھی مقبول تھی۔ خواتین کے کئی اداروں سے منسلک تھی۔ وہ اپنی فکر انگیز اور مدلل تقریروں سے بڑے بڑے لوگوں کے منہ بند کر دیتی تھی۔

پرت پِیا بتانے لگی ——

''ہم لوگوں میں جیسے کسی عورت کو اس کا مرد چھوڑ دیا اور وہ عورت دوسرے آدمی کے ساتھ جنگی (زندگی) بِتانا چاہے تو.....''

''یعنی بال بچے ہوں تو بھی؟'' مکتا نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں اور کیا! اور وہ دوسرا اوالا مرد بھی دوہاجو ہوگا نا۔''

''دوہاجو کیا؟''

مکتا کی کم سمجھی پر پرت پِیا بے ساختہ ہنس پڑی تھی۔ اس کے چہرے پر فخر کا ایک رنگ اُبھر آیا۔ اپنی زبان، اپنی قواعد پر.....

''دوہاجو یعنی اس نے بھی عورت چاہے چھوڑ دی ہو، چاہے مر گئی ہو... تو اس سے ہوتی ہے۔''

''کیوں؟ کوئی کنوارا لڑکا چھوڑی ہوئی عورت سے شادی نہیں کر سکتا؟''

''ارے میم صاحب! کیسی بات کرتی ہیں آپ ....؟ کنوارا لڑکا چار بچن کی مائی لے جا کر کیا کرے گا! دوہاجؤ مرد بھلے ہی کنواری لڑکی سے کرلے .....''

مکتا کو ایک نکتہ مل گیا تھا۔ اس نے مزید جاننے کے لیے پرت پیا کی طرف دیکھا۔ پرت پیا بتا رہی تھی —— ''تو جب چھوئی عورت کسی دوہاجؤ مرد کے سنگ بیٹھتی ہے تو وہ سگائی ہوتی ہے یعنی بغیر گاجے باجے کے، آٹھ دس لوگ باراتی آئیں گے اور کھانا پینا ہوگا۔ شام تک عورت کو بدا کراکے لے جائیں گے۔ اور بیاہ! ..... گاجے باجے کے ساتھ بڑی آن بان سے لڑکا لڑکی کا بیاہ ہوتا ہے۔''

''تو ایسی ہی سگائی بھیجنے کے لیے تمھارے پتا جی کہہ رہے ہیں؟''

''ہاں، میم صاحب، لیکن ہم نہیں جاؤں گی۔ ہم بابو سے کہہ دیے ہیں کہ دو بچوں کو لے کر ہم یہیں ایک مڑئی (جھونپڑی) ڈال کر جنگی بِتالوں گی لیکن اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ ایک بار جا کر بھوگ لیا۔''

پرت پیا اُداس ہوگئی تھی۔ لیکن اس کی زندگی کے اس راز کا انکشاف مکتا کے لیے چونکا دینے والا تھا۔

''کیا؟ ایک بار سگائی ہو چکی ہے تمھاری؟''

''سگائی نہیں میم صاحب، دھوکہ تھا۔''

''کیا ہوا تھا؟ بتاؤ گی؟''

مکتا کو کچھ نئی سچائیاں معلوم ہونے کی اُمید نظر آئی۔ پرت پیا اُداس آنکھوں سے سامنے کی دیوار کو دیکھتے ہوئے بتانے لگی۔ اس کے منہ سے آنچل ہٹ گیا تھا۔ شاید دکھ بھرے لمحوں میں عادتیں بھی ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔

''وہ ہمارے گاؤں کی ہی بِٹیا لگتی تھی۔ ہم لوگ پھوا پھوا گُہراتے (بلاتے) تھے۔ وہ دلّی ہی رہتی تھی اپنے آدمی کے سنگ۔ نہ بال نہ بچے۔ بال بچوں کا درد کیا جانے گی بھابھی جی۔ وہی، سال پہلے آئی تھی اور بابو کو سمجھا بجھا کر تیار کرلیا۔ بابو بولے —— ''دونوں بچوں کو ہم دیکھ

لیں گے تم اس کے ساتھ چلی جاؤ۔ من مسوس کر ہم چلی گئی اس کے ساتھ۔''

پرت پیا کچھ دیر کے لیے رُکی اور دوبارہ بتانے لگی ——

''پتہ چلا کہ وہ ساٹھ برس کا بڑھوا تھا۔ وہیں دلّی میں ٹھیلا لگا تا تھا۔ عورت مر گئی تھی۔ دو بڑے بڑے جوان لڑکے اپنا پریوار لے کر الگ رہتے تھے۔ کھانا بنانے میں پریشانی ہوتی تھی اسی لیے .... ہم ایک ہفتہ اس کے ساتھ رہی لیکن بھابھی جی، کبھی کوئی وہ طرح کی بات وَیوہار نہیں رکھی ہم .... کبھی وہ بلائے بھی تو ....''

پرت پیا کو بتاتے ہوئے قدرے ہچکچاہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ مکتا نے اس شرمناک حصے کو دوسری طرف موڑ دیا ——

''تم نے اسے اپنے بچوں کے بارے میں نہیں بتایا؟''

''اس گندی عورت نے ہمیں کنوار بتا کر اس کے پاس بھیجا تھا۔'' پرت پیا اپنی اس پھوپھی پر برہم ہوتے ہوئے بولی تھی۔

''ایک دن بڑھوا ہم سے پوچھا بھی کہ تو' بلانے پر کاہے نہیں آتی رے؟ کاہے ہمیشہ مرجھائی رہتی ہے؟ تب ہم بھی بتا دی کہ ہمارے دو بچے ہیں۔ ان کی یاد آتی ہے۔ ہم ان کو چھوڑ کر نہیں رہ سکتی۔ تم ہمارے ساتھ سگائی کیے تو ان کو بھی ساتھ رکھو نہیں تو ہمیں بھی چھوڑ دو۔''

''پھر کیا ہوا؟'' مکتا، پرت پیا سے سب کچھ جان کر کوئی نتیجہ اخذ کرنا چاہ رہی تھی۔

''ہونا کیا بھابھی، بڑھوا بگڑ گیا۔ بولا، کیا بکتی ہے تو' رے۔ تیری پھوا تو تمھیں کنواری بتا کر مجھ سے پانچ ہزار روپے تیرے بابو کی رضامندی کے لیے لے گئی۔''

یہ سب بتاتے ہوئے پرت پیا کی آنکھیں غصّے سے جل رہی تھیں اور ہونٹوں کے دونوں کناروں پر تھوک کا سفید جھاگ بننے بگڑنے لگا تھا۔

''اِدھر بابو سے بھی وہ دو ہزار روپیہ لی اور اُدھر بڑھوا سے بھی۔ آج پیسہ واپس نہیں کی کمینی نے۔ تب ہم سوچی کی لے جاتے بخت کیوں وہ ہمیں سکھا پڑھا رہی تھی کہ اس کے سامنے قبولنا نہیں کہ تمھارے بچے بھی ہیں ..... بس ایک رات چوری سے ہم گاڑی میں بیٹھ کر بھاگ

آئی بھابھی جی۔ کیسے کیسے گھر پہنچی ہم، بس مت پوچھیے۔ بڑی خراب حالت ہوئی ہماری .....''

پرت پیا کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ گلا رُندھ گیا۔

''کوئی بات نہیں۔ چپ ہو جاؤ۔ اب تو سب بیت گیا نا؟''

مکتا نے بے دلی سے پرت پیا کو تسلی دی۔ مکتا کو پرت پیا کی کہانی میں کوئی نئی بات نہیں ملی۔ ایسا تو ہر روز کسی نہ کسی لڑکی کے ساتھ ہوتا رہتا ہے خواہ وہ پڑھی لکھی ہو یا اَن پڑھ۔ کبھی فلموں میں کام کرنے کا لالچ یا غیر ملکوں میں گھومنے کی ترغیب، خود کفیل بننے کی چاہ یا معاشی تنگی سے بیزاری، فریبی ساتھی کے ساتھ نئی زندگی شروع کرنے کی چاہت یا بری عورتوں کے ذریعے بہکائی گئی لڑکیوں کے استحصال کی کہانیوں سے روزانہ اخبارات بھرے رہتے ہیں۔ کوئی نئی بات ڈھونڈنی ہوگی۔

یہ سب سوچتے ہوئے مکتا نے چائے کا آخری گھونٹ حلق کے نیچے اُتارتے ہوئے کپ پرت پیا کو پکڑا دیا۔ پرت پیا اپنا بھی پیالہ زمین سے اُٹھا کر پیروں سے دھپ دھپ کی جانی پہچانی آواز نکالتے ہوئے رسوئی کی طرف چلی گئی۔ مکتا کا دل یکا یک پرت پیا کے لیے پگھل گیا۔ وہ اتنی کم عمر میں زندگی کے کتنے کڑوے تجربے اپنی جھولی میں سنبھالے ہوئے جی رہی ہے۔ شروع میں جب وہ مکتا کے یہاں گھر کی صفائی کا کام مانگنے آئی تھی تو اس کے چہرے پر مصیبت اور غربت کی پرچھائیں تھی۔ اس کے جانے کے بعد پڑوسن نے مکتا کو ہدایت دی تھی ——

''مکتا جی، ابھی آپ یہاں نئی نئی آئی ہیں۔ اسے نہیں جانتیں۔ دھوکہ کھا جائیں گی۔ اس کا آدمی چوری اور قتل کے جرم میں جیل میں ہے۔ یہ سب اچھے نہیں ہیں۔''

اور مکتا نے پرت پیا کو دوسرے دن لوٹا دیا تھا۔ پرت پیا سمجھ گئی تھی کہ اس کے شوہر کا ماضی، حال بن کر اس کے مستقبل کو لگاتار ڈستا رہے گا۔ اس نے اگلے دن آ کر مکتا کے پیر پکڑ لیے۔

''میم صاحب، ہمارے آدمی کے کرتوت کی وجہ سے ہمیں کوئی کام پر نہیں رکھتا۔ پر، ہم برا نہیں ہوں میم صاحب۔ وشواس کریں۔ کوئی فعل دیکھیے گا تو پرت پیا کا کان پکڑ کر باہر کر دینا میم صاحب۔ میرے بال بچوں کے تیل صابن کا خرچا تو نکل آئے گا کام کر کے۔ بابو مائی کب

تک بٹھا کر کھلائیں گے۔''

اور مکتا کو رحم آ گیا۔ اس نے پرت پیا کو کام پر رکھ لیا لیکن ہر پل چوکنی رہتی۔ نہ جانے کب پرت پیا پر شوہر کا سایہ پڑ جائے۔ پرت پیا بھی اپنے شوہر کی اس کالی چھایا کو ہمیشہ اپنے سے دور دھکیلنے کی کوشش میں پیروں سے زور زور سے دھپ دھپ کی آواز نکالتے ہوئے چلتی تاکہ اس کے کسی ایک جگہ ٹھہرنے کا شک کسی کے دل میں پیدا نہ ہونے پائے۔ کونے والے کمرے میں پڑھائی لکھائی کرتے ہوئے بھی مکتا کو معلوم ہوتا رہتا کہ اب پرت پیا ڈریسنگ ٹیبل کے پاس ہے یا بیٹھک میں صوفے کے نیچے جھاڑو لگا رہی ہے یا رسوئی میں گیس کا چولھا کھینچ کر اس کے پیچھے دال، سبزی کے دھبے صاف کر رہی ہے۔ ایسے موقعوں پر پڑوسن کا پڑھایا ہوا سبق بے معنی ہو کر رہ جاتا۔

مکتا نے اپنے اسٹڈی روم میں جا کر کتابوں کو اُلٹنا پلٹنا شروع کر دیا۔ شاید کوئی موضوع ہاتھ لگ جائے۔ ''ویدک سنسکرتی میں ناری'' کتاب پر اس کی نگاہیں ٹھہر گئیں۔ کتاب کو ہاتھ میں لیے ہوئے وہ بیڈروم میں آ گئی اور سرہانے کا ٹیبل لیمپ جلا کر اسے دیکھنے لگی۔ پڑھنے سے پہلے ہی خیالات کی ایک تیز لہر آئی اور اس نے کتاب بند کر دی .... کیا ملے گا اس میں ..... یہی نا کہ ویدک عہد میں عورتوں اور مردوں کے حقوق مساوی تھے بلکہ کہیں کہیں تو مادر سری سماج بھی موجود تھا۔ گھر کی مالی باگ ڈور عورتوں کے ہاتھوں میں ہونے کی وجہ سے خاندان میں ان کو بالادستی حاصل تھی .....اسی طرح جیسا کہ آج کل مردوں کو حاصل ہے۔ .....ہوُں! کیا فرق پڑا ہوگا اس سے؟ کیا اس وقت عورتیں دُہرے استحصال کا شکار نہیں ہوئی ہوں گی؟ کیا تخلیق اور پرورش کے فرض سے آزاد ہو پائی ہوگی عورت؟ کیا مرد کی نفسانی خواہش سے بچنے کے لیے اپنی مرضی یا طاقت سے کبھی انکار کر پائی ہوگی عورت؟ نہیں نا، تو پھر کیسی مساوات، کیسے اختیارات؟ .....بس فرض ہی فرض۔

مکتا نے کتاب رکھ دی اور بے مقصد سی چھت کی دیوار پر اپنی نگاہیں مرکوز کر لیں۔ بغل میں رسوئی سے پرت پیا کے برتن دھونے کی آواز آ رہی تھی۔ مکتا نے نوٹ شیٹ اُٹھائی اور خیالوں

کو یکجا کرتے ہوئے لکھا —— “عورت کو کڑچھی نہیں، قلم دو۔” نہ جانے کیوں ملتا، پرت پِیا کے ہی اردگرد کچھ ڈھونڈنا چاہتی تھی۔ آج بوڑھے آدمی کے ساتھ اس کی سگائی کے موضوع سے گزر کر اس کا ذہن پچھلے کئی موضوعات کو دہرانے لگا تھا۔ لگ بھگ ایک مہینہ پہلے جب ملتا کالج سے آ کر بس بیٹھی ہی تھی کہ پرت پِیا غصّے سے تمتماتے ہوئے چہرے کے ساتھ آ کر اس کے پاس کھڑی ہوگئی تھی۔ ملتا نے تھکے ہوئے لہجے میں پوچھا تھا ——

“کیا بات ہے پرت پِیا؟ کیا ہوا؟”

“ارے میم صاحب، کا کہوں؟ جمانہ میں آگ لگ گیا ہے۔ اؤ پُھکَونا، مہتبوا ہے نا، ارے وہی اینٹا بھٹّا پر لیبر ہے، بھگوَتی مائی لے جائیں اسے۔ باپ کے عمر کا ہے لیکن جوانی چڑھی ہے۔”

وہ تھوڑا شرما گئی لیکن اگلے ہی پل شرم کو پرے دھکیلتے ہوئے اس کے کالے کرتوتوں کو ننگا کرنے کے لیے تیار ہوگئی ——

“وہ روز رات کو کچھ دیر کے لیے ہمارے گھر ٹی وی دیکھتا ہے۔ ہم بھی کہی کی جانے دو، مائی باؤ کے کام پر چلے جانے کے بعد گھر میں چہل پہل رہے گی۔ باپ کے عمر کا ہے۔”

“کیا ٹی وی بھی رکھی ہے گھر میں؟”

پرت پِیا کی موجودہ حالت اور شوق پر ملتا کو تعجب ہوا لیکن پرت پِیا نے بلا جھجک بتایا ——

“وہ چھوٹی والی بہن کے بیاہ میں دینے کے لیے بابو نے قرضا لے کر خریدے ہیں۔ جب تک ہے، تب تک بجلی کے تار پر آنکڑی پھینک کر ہم لوگ چلا کر دیکھتی ہوں۔”

لیکن اس وقت ٹی وی سے زیادہ اہم موضوع شاید دوسرا تھا اس لیے پرت پِیا اسے اور آگے نہ بڑھاتے ہوئے دوبارہ پرانے موضوع پر لوٹ آئی۔

“تو جانی نہ میم صاحب، آج ہماری بہن ہم سے بتائی کہ ای مہتبوا ٹی وی دیکھتے وقت روز دھیرے دھیرے کھسک کر اس سے سٹ کے بیٹھ جاتا ہے اور اپنی کہنی سے .... اس کا جسم چھوتا ہے ..... کل تو اس کو سو روپیّا پکڑا رہا تھا .... کمینہ ...... او کے کالی مائی کوپ کریں۔ سیان لڑکی ہے میم صاحب .... کہیں کوئی بات نہ کرے غصہ میں ..... آج تو ہم اسے خوب جھاڑی ہوں .....

سوچتی ہوں ہم کہ پولس میں رپٹ ......آپ کی کوئی جان پہچان ہے میم صاحب تو ..... نہیں تو کہیں غصہ میں وہ کوئی الٹا سیدھا کام .....''

پرت پیا کے کئی آدھے ادھورے جملے ایک ساتھ شک بن کر کھونٹیوں پر لٹک سے گئے تھے۔ مکتا کو اس اَن دیکھے مہتبوا سے اسی طرح نفرت ہوگئی تھی جیسی نفرت آج تک اس کے من میں اپنے پڑوس کے بابا کرپا شنکر کے لیے تھی جو بچپن میں شام کے وقت سبھی بچوں کو کہانیاں سنانے کے لیے بلاتے تھے اور مکتا کچھ زیادہ ہی لاڈلی ہونے کی وجہ سے ان کی گود میں جا بیٹھتی تھی۔ لیکن ایک دن بابا کی گود میں کچھ اٹ پٹا سا تجربہ ہوا تھا جسے نہ تو وہ آج تک بھلا پائی تھی اور نہ ہی شرم کی وجہ سے کسی کو بتا سکی تھی۔ بس، بابا سے کہانیاں سننے سے نفرت سی ہوگئی تھی ..... وہ لمسی نفرت .....آج وہی نفرت پھر سے من میں بیدار ہوگئی تھی۔ مکتا نے اپنی شائستگی کے پردے میں پرت پیا کی نفرت کو بھی چھپانے کی کوشش کی —

''دیکھو، ہم سے کہہ دی تو کہہ دی، اب کسی اور سے نہیں کہنا۔ ورنہ لوگ تمھارے اور تمھاری بہن کے بارے میں غلط باتیں سوچیں گے۔ بدنامی ہوگی سو الگ۔''

''ارے میم صاحب! آج ہم چپ رہ جاؤں گی تو اس کا حوصلہ نہیں بڑھ جائے گا؟ کل کو دوسری بہن بٹیا کو .....''

کمزور سی پرت پیا کی اس بروقت استقامت کے سامنے مکتا کو اپنے شائستہ اصول بیمار سے محسوس ہوئے۔ شاید سماج میں کمزور ہونے کی وجہ سے پرت پیا کی حالت سبھی کے سامنے بے پردہ ہے اور اسی لیے اسے کھل جانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں، کوئی ڈر نہیں۔ جبکہ شروع سے رسم و رواج اور اصولوں سے جڑی مکتا میں کھلنے کی ہمت نہیں ہے۔ شاید اسی لیے آج تک وہ سب کچھ سہہ رہی ہے۔ چپ چاپ، گھٹتے ہوئے .....بے پردہ ہوجانے سے خوف زدہ .....!

اس دن جب اس کے شوہر نے کورٹ میں اس پر جذباتی لمحوں میں سرد مہری کا الزام لگا کر اس سے آزاد ہونے کی کوشش کی تھی، مکتا چیخ چیخ کر سب کو بتا دینا چاہ رہی تھی کہ اس کی نفسانی خواہش کی گرمی پر ممتا کی ٹھنڈک بھاری پڑ جایا کرتی ہے لیکن اس کی یہ خواہش اس کی

شائستگی کے بوجھ تلے دب گئی اور وہ سر جھکائے، لوگوں سے نظریں چراتے ہوئے، کورٹ سے نکل کر گھر میں آ کر برسوں تک اپنے آپ کو قید رکھا۔ اس نے ایسا صرف اس لیے کیا تھا کہ وہ خود کو دوسروں کے سامنے بے پردہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اپنے پانچ سال کے بیٹے کو لے کر وہ دوسرے شہر میں نوکری کرنے کے لیے چلی آئی تھی۔ چپ چاپ ..... کسی کو کچھ بتائے بغیر۔ بعد میں پتہ چلا کہ اس کے شوہر نے دوسری شادی کر لی۔ شاید اسی لیے اس نے مکتا کی فطری شرم اور شائستگی کو اپنا ہتھیار بنایا تھا۔

مکتا کا دل بدلے کے جذبے سے بھر گیا تھا لیکن وہ آج تک کچھ بھی نہ کر سکی۔ کبھی کبھی وہ خود کو تولتی۔ کیا سچ مچ اس کے اندر گرمی کی بجائے ٹھنڈک بھری ہوئی ہے جو صرف ننھے رِشبھ پر ہی برستی ہے؟ اور تب تب سامنے کے کیلنڈر پر ایک مکالمہ چپک جاتا .....

''آپ بہت کم عمر میں ذہنی طور پر بہت بالغ ہیں مکتا جی۔'' اپنے ساتھی کمل جی کے اس جملے پر مسکرا کر مکتا جواب دیتی ——

''ہو سکتا ہے۔ کیوں؟''

''آپ کی اس بات سے میں بہت متاثر ہوں۔ اپنی بیوی سے بھی میں آپ کی بہت تعریف کرتا ہوں۔ کبھی کبھی تو اسے جلن سی ہونے لگتی ہے۔''

''آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے کمل جی۔ ایک دن لے آیئے انھیں ..... ان کا بھرم میں ان کے دل سے نکال دوں۔''

''بس، آپ کی اسی سمجھ داری کا تو میں روز بروز قائل ہوتا جا رہا ہوں۔ ایک درخواست ہے میری۔ مانیں گی؟''

''کیا؟''

''میں آپ کو چھو کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ ..... بس ہاتھ چھو کر دیکھنا چاہتا ہوں ..... بھلے ہی میری بیوی کے سامنے ہی آپ اس کی اجازت دے دیں۔ بس ایک بار ..... چھوؤں گا۔''

اس وقت بھی کمل کی آنکھوں میں بچوں کی سی ضد اور کھلا پن دیکھ کر وہ کانپ اُٹھی تھی۔ یہ

کیسی ضد ہے کمل کی؟ اس کا دل دھڑک اُٹھا۔ دھک دھک دھک ..... وہ ڈر نہیں تھا .... پاکیزہ محبت کی خواہش بھی نہیں۔ پھر کیا تھا وہ؟ کیا وہی نفسانی خواہش .... چھی چھی .... کیوں چھی؟

یہ حقیقت تھی کہ وہ کمل کی درخواست پر کانپ اُٹھی تھی۔

مکتا اپنے اصولوں کی وجہ سے تھوڑی شرمندہ اور لاجواب ہوکر رہ گئی تھی۔ یہی اصول اس کے شوہر کے الزامات کا جواب تھے لیکن انھیں بھی وہ دنیا کی شرم کی وجہ سے دِکھا نہیں سکتی تھی۔ کم سے کم پرت پِیا میں وہ حوصلہ تو ہے۔ کتنا فرق ہے پرت پِیا اور مکتا کی حالت میں؟ پرت پِیا نڈر ہوکر اپنے بچوں کی ممتا کے لیے اپنی سگائی توڑ سکتی ہے اور اسی ممتا کے لیے مکتا کو بھی علیحدگی اختیار کرنی پڑی لیکن اس کی جانب سے نہیں بلکہ شوہر کی جانب سے۔ بابا اور مہتبوا میں کیا فرق تھا؟ نوٹ شیٹ پر لکھا ہوا اس کا اپنا ہی جملہ ''ناری کو کڑچھی نہیں، قلم دو'' اس کا منہ چڑا رہا تھا۔ قلم پکڑ کر بھی وہ کتنا آزاد ہو پائی تھی جو پرت پِیا کڑچھی پکڑ کر نہیں ہو پائی تھی۔ اور مکتا کو اس بار یومِ خواتین پر بولنے کے لیے موضوع مل گیا تھا۔

* * *

چیک پوسٹ

وہ دونوں سڑک پر غلط سمت سے آ رہی تھیں یعنی بائیں جانب چلنا تھا لیکن چل رہی تھیں دائیں جانب۔ سڑک پار کر کے شاید وہ صحیح سمت میں ہو بھی جاتیں لیکن ایک کے پیچھے ایک بنا فاصلہ رکھے کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار کے درمیان سے سڑک پار کرنا مشکل تھا۔ بہت دور ہی سے وہ دونوں دِکھائی دے رہی تھیں۔ کئی بار گاڑیوں کی قطار کے پاس سے مڑ مڑ کے وہ واپس ہوگئی تھیں۔ شاید کسی بھی گاڑی والے نے ایک آدمی کے گزرنے کی جگہ بھی نہیں چھوڑی تھی۔ اسکوٹر یا سائیکل سوار کی قطار بیچ میں سے نکلنے لگتی تو وہ اٹک کر رہ جاتیں۔ جلدی کس کو نہیں تھی؟ بس دوسروں کی کسی کو پروا نہیں تھی۔ پانی اتنا برسا تھا کہ ساری سڑک پانی سے بھر گئی تھی۔ یوں بھی اس شہر میں نکاسی کا انتظام درست نہ ہونے کی وجہ سے برسات کے موسم میں ہمیشہ سڑکوں پر پانی بھرا رہتا ہے۔ جو کسر باقی رہ جاتی ہے اسے میونسپلٹی اپنی صفائی مہم کے تحت سڑک کے عین وسط میں بھاری بھرکم مشینیں لگا کر اور موٹے موٹے پائپ بچھا کر پوری کر دیتی ہے۔ راہ گیر دائیں بائیں سے بچ کر نکلتے رہتے ہیں۔

آج گھر سے اسپتال کے لیے نکلتے ہی بارش شروع ہوگئی تھی۔ اؤدین نے کار کا شیشہ چڑھا لیا تھا۔ وائپر کام نہیں کر رہا تھا اس لیے وہ احتیاط سے دھیرے دھیرے گاڑی چلا رہا تھا۔ یوں بھی اس شہر میں گاڑی چلا لینا گویا دنیا کے کسی بھی کونے میں ڈرائیونگ کا لائسنس حاصل کر لینے کے مترادف ہے۔ کہتے ہیں کہ بھگوان شیو کی نظرِ کرم ہے اس شہر پر۔ عام طور پر یہاں بے وقت موت نہیں ہوتی اور ہوتی ہے تو یقینی طور پر موکش (نجات) بھی مل جاتی ہے۔ لوگوں کا یہ عقیدہ ہے کہ جس پر شیو کی مہربانی ہوتی ہے اسے وہ اپنے چرنوں میں پناہ دے دیتے ہیں، کہیں

ہندی کہانی کا ارتقا — ایک سرسری جائزہ

غلام نبی مومن

کہانی سننا اور سنانا انسانی فطرت کا خاصہ ہے۔ اپنے اور دوسروں کے ساتھ پیش آنے والی باتوں کو بیان کرنا ہی کہانی ہے۔ قدیم زمانے سے اب تک کہانی میں کئی غیر معمولی تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں لیکن کہانی میں کسی نہ کسی روپ میں کہانی پن ضروری باقی رہا ہے۔

ہندی میں جدید افسانے کا آغاز بیسویں صدی میں انگریزی ادب کے زیر اثر ہوا۔ جون ۱۹۰۰ء میں رسالہ 'سرسوتی' میں کشوری لال گوسوامی کی کہانی 'اِندؤمتی' شائع ہوئی جو شیکسپیئر کے ڈرامے 'Tempest' سے ماخوذ تھی۔ ۱۹۰۱ء میں 'چھتیس گڑھ متر' میں مادھو راؤ سپرے کی کہانی 'ایک ٹوکری بھر مٹی' اور 'سدرشن' میں رسالے کے ایڈیٹر پنڈت مادھو پرساد مشر کی کہانی 'من کی چنچلتا' اور ۱۹۰۳ء میں شُکل جی کی کہانی 'گیارہ ورش کا سمے' شائع ہوئی تھی۔ ان چار کہانیوں کو ہندی کے جدید افسانے کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۰۹ء میں رسالہ 'اِندؤ' جاری ہوا جس میں کئی عمدہ بنگلہ کہانیوں کا ہندی ترجمہ شائع ہوا۔ ۱۹۰۰ء سے ۱۹۱۰ء تک کی ابتدائی کہانیوں میں راکھی بند بھائی (برندا بن لال ورما)، رسیا بالم (جے شنکر پرساد)، سکھ کی موت (پنڈت پارس ناتھ) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں جے شنکر پرساد کی کہانی 'گرام' شائع ہوئی جسے ہندی کی پہلی طبع زاد کہانی سمجھا جاتا ہے۔

۱۹۱۵ء میں 'سرسوتی' میں پنڈت چندر دھر شرما گلیری کی کہانی 'اس نے کہا تھا' شائع ہوئی جس میں انفرادی محبت، حب الوطنی اور فرض شناسی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ دسمبر ۱۹۱۵ء میں اسی رسالے میں منشی پریم چند کی پہلی ہندی کہانی 'سوت' شائع ہوئی۔ منشی جی نے ۱۹۳۶ء تک تقریباً تین سو کہانیاں لکھ کر ہندی کے دامن کو ایسا مالا مال کیا کہ ہندی کہانیوں کا شمار عالمی افسانوی ادب میں ہونے لگا۔

سے بھی بلوا لیتے ہیں اور کسی پر نظرِ کرم نہ ہو تو کال بھیرو (موت کا فرشتہ) اس کے دل کو اس شہر سے اُچاٹ کر دیتے ہیں۔ شاید اسی لیے اسے نیویارک سے بلا بھیجا ہے۔ اس مشینی شہر سے اس کے دل کو اُچاٹ کر کے ..... وہ مسکرا اُٹھا۔ بارش بند ہو چکی تھی لیکن ٹریفک پہلے ہی کی طرح جام تھا۔ اس نے کھڑکی کا شیشہ دھیرے دھیرے اُتار دیا۔ بھیگی ہوا کا تازہ جھونکا گاڑی کے اندر آ گیا۔ بادلوں کی وجہ سے دن کے دس بجے بھی شام کا سہانا پن گھر آیا تھا۔ ہلکی نمی، ہلکا اندھیرا۔ دل مدہوش ہو کر گنگنانے لگا۔ اس نے مدھم آواز میں ٹیپ آن کر دیا۔ کوئی پرانا فلمی گیت بجنے لگا تھا۔ اس نے دوسرا کیسٹ تلاش کیا۔ غلام علی کی غزلوں والی کیسٹ مل گئی۔ اس نے پہلی کیسٹ نکال کر اسے لگا دیا اور ٹیپ آن کر دیا۔ کیسٹ بجنے لگا .... ''برن لاگن ساون بندیا....''

وہ دونوں اسی طرف آ رہی تھیں۔ اس طرف دیکھنا مجبوری تھی۔ کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار دیکھنے میں بھلا کسے دلچسپی ہو سکتی ہے؟ نیویارک میں ہوتا تو یہ جام ٹریفک میڈیا کے لیے ایک بڑی خبر ہوتی لیکن یہ تو یہاں کے معمولات میں شامل ہے۔

''سالے اندھا ہو گیا ہے کیا؟'' ایک موٹا آدمی پانی میں چلتے چلتے، تیزی سے گزرنے والے ایک ٹیمپو والے پر غرایا۔ ٹیمپو والا اپنی رفتار سے پانی کو دائیں بائیں کاٹتے ہوئے، بوچھار اُڑاتے ہوئے نکلا چلا گیا اور وہ دور تک ٹیمپو کو گھورتا رہا۔ اس نے بھی کار کی کھڑکی سے جھانک کر ٹیمپو کو دیکھا۔ اس کی پشت پر لکھا ہوا تھا —— ''بری نظر والے تیرا منہ کالا۔'' پھر وہ ٹیمپو پل بھر میں نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

''ائی جا، ای بنارس ہو۔'' کہتے ہوئے دو منچلے سائیکل سوار لڑکے تیزی سے گزر گئے۔ وہ مسکرا اُٹھا۔ کچھ بھی تو نہیں بدلا ہے یہاں۔ وہ شہر کو جیسا چھوڑ کر ایم ڈی کرنے کے لیے نیویارک گیا تھا، دس برسوں کے بعد بھی سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے۔ پتہ نہیں کیوں اس کا دوست اکھلیش کہہ رہا تھا کہ یہاں بھی تیزی سے تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔ لوگوں کی سوچ میں زبردست تبدیلی آئی ہے۔ لندن اور نیویارک اب سات سمندر پار نہیں رہا بلکہ ایک ڈبے کے ذریعے ہمارے گھروں میں گھس آیا ہے۔ وہ اُس کی اس بات سے متفق نہیں تھا کیونکہ اندرون میں ہونے

والی تبدیلی کچھ تو باہر دِکھائی دے گی۔ گلوبلائزیشن کا اثر بھارت پر کچھ تو پڑا ہے لیکن اکھلیش جتنا سمجھتا ہے اتنا نہیں ......۔ اکھلیش کبھی بیرون ملک نہیں گیا ورنہ اسے بھی محسوس ہوتا کہ مغربی ملکوں کی مشینی ذہنیت کتنی تکلیف دہ ہے۔ اکھلیش نے ہنستے ہوئے کہا تھا —— ''بیٹا، ابھی نئے نئے لوٹے ہو نا اس لیے بڑا اچھا لگ رہا ہے۔ چونکہ وہاں کی سوچ حاوی ہے اس لیے یہاں ہونے والی تبدیلیاں تمھاری سمجھ میں نہیں آئیں گی۔ دو چار مہینے گزرنے دو، پھر پوچھوں گا انڈیا کے بارے میں تمھارا کیا خیال ہے۔''

وہ مسکرا اُٹھا۔ ''ہوں، ابھی تم نے بھی باہر کی ہوا نہیں کھائی ہے اکھلیش۔ ایک بھارتی کا دل وہاں بڑی بے صبری سے ایک ایک دن گزارتا ہے کیونکہ وہاں نہ کسی کے دُکھ کا ساتھی ہوتا ہے نہ سکھ کا۔ سب اپنے اپنے میں گم ہوتے ہیں۔ موسم کی طرح دل پر بھی ٹھنڈی برف جمی ہوتی ہے۔ جذبوں کی گرمی کبھی نصیب ہو تو یہ برف پگھلے نا؟ ایک دن وہ ہنری صاحب کے گھر والوں سے ملنے چلا گیا تھا۔ گھر والے کون؟ دو فرد —— ایک مرد اور ایک عورت —— بوڑھا، بوڑھی۔ ہنری کے ساتھ وہ خود گاڑی چلا رہا تھا۔ جنگل کے راستے میں کئی پیڑ خوبصورت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ جنگل بھی ایسے منظّم اور صف بند کہ انھیں جنگل کہتے ہوئے ہچکچاہٹ ہوتی تھی۔ اس نے بڑے اشتیاق سے پوچھا تھا —— ''ان پھلوں کا کیا استعمال ہوتا ہے؟ یعنی کچا کھاتے ہیں یا سبزی بناتے ہیں؟'' ہنری صاحب مسکرا اُٹھے، ''آپ انڈین ہر چیز کو فائدے کے نقطۂ نظر سے کیوں دیکھتے ہیں؟ یہ پھل تو بس دیکھنے کے لیے ہیں۔ درختوں کی سجاوٹ۔ انھیں کھائیں گے کیوں؟''

وہ دل ہی دل میں ہنری کی باتوں پر ہنس پڑا تھا۔ سچ ہے، کھانا پینا تم لوگ کیا جانو۔ گھر میں کوئی اچھی گرہستن ہو تو لذیذ کھانے پکیں۔ تم لوگ تو خاندان میں رہ کر بھی خاندان کے فرد نہیں، ہم سفر ہوتے ہو۔ وہ فوراً بول پڑا —— 'جی، ہمارے یہاں تو ساری فطرت سے ایک روحانی تعلق ہوتا ہے، ایک مکالمہ قائم ہو جاتا ہے۔ لین دین کا عمل جاری رہتا ہے۔ ہر گاؤں کا ایک محافظ ڈیہہ، برم، بیر، بابا یا مائی کے روپ میں پیپل، برگد یا نیم پر رہتا ہے۔ پیر، مزار، تال تلیّا میں کوئی نہ کوئی آتما گھومتی رہتی ہے۔ جس کی پوجا، ارچنا، چڑھاوا کے روپ میں ایک ناقابلِ بیان

ملاقات کی صورت بنی رہتی ہے۔ وہ ہماری فصلوں کی حفاظت کرتا ہے، وقت پر پانی اور دھوپ دیتا ہے۔ غم کی حالت میں، قدرتی مصیبتوں کے ساتھ لڑتے ہوئے بھی ہم اسے مختلف طریقوں سے منانے کی کوشش کرتے ہیں۔

ہنری ہنس پڑا تھا۔

''ڈاکٹر، کیا یہ نری جذباتیت یا یوٹوپیا نہیں لگتا تمھیں؟''

''لگتا ہے لیکن صرف ان لوگوں کو جو پڑھ لکھ کر بہت زیادہ منطقی اور دانشور بن گئے ہیں۔ جہاں تک میں سوچتا ہوں دانشور اور منطقی ہونے کے بعد یوٹوپیا میں جینے کا سکھ بھی چھن جاتا ہے۔ ذہانت کے سوتے سؤکھنے لگتے ہیں کیونکہ استدلال سے تجزیہ کرنے کے بعد سب کچھ ہمارے سامنے ویسے ہی الگ الگ ہوکر پھیل جاتا ہے جیسے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش۔ آپ مانتے ہیں کہ نہیں ہنری صاحب؟''

''ایک حد تک اتفاق کیا جاسکتا ہے۔ شاید اسی لیے انڈیا کو دنیا کا روحانی گرؤ مان لینے میں کوئی برائی نہیں ہے۔ وہاں کا میڈیکل بھی اعتقاد اور روح کو سب سے بڑا مان کر ہی علاج کرتا ہے۔ جہاں موت کو پرانے کپڑے کی طرح سمجھا جاتا ہے، بلاشبہ وہاں کے فلسفے اور روحانیت میں کوئی تو ایسی خاص بات ہے جو آج تک تہذیب کے اتنے زینوں کو پار کرنے کے بعد بھی سالم و ثابت ہے۔ میں سلام کرتا ہوں اس دیش کو۔'' ہنری نے دایاں ہاتھ سینے پر لگا کر آنکھوں کو مس کیا۔ وہ مسکرا اُٹھا —— ایک فتحمندانہ مسکراہٹ۔ بھارت میں رہتے ہوئے وہ کبھی بھارت کو اپنے اتنے قریب نہیں پا سکا تھا لیکن نیویارک آتے ہی وہ پورے بھارت کو اپنے سر اور کندھوں پر اُٹھائے گھومتا پھرتا تھا۔

ہنری صاحب کے گھر پہنچا تو ایک معمر عورت نے دروازہ کھولا۔ جذبات سے عاری چہرہ۔ گھٹنوں کے اوپر تک کالی اسکرٹ، ہلکے کریم رنگ کی چھوٹی ٹی شرٹ۔ چہرے پر جھریوں کے بیچ ایک روکھا سا اضمحلال۔ اسے بڑھیا اماں یاد آگئیں۔ دروازہ کھولتے ہی ایک پیار بھری مسکراہٹ —— ''آ گیا تو۔ چل جلدی سے تھوڑا ٹھنڈا ہولے۔ میں تب تک ٹھاکر جی کو بھوگ لگا دوں پھر

ساتھ ہی کھالیں گے۔ تیرے جانے کے بعد مجھے کھانے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا۔'' اسے معلوم تھا کہ پاپا کے دوسرے شہر میں ٹرانسفر ہوجانے کے بعد ممی ان دونوں کو اس گھر میں اکیلا چھوڑتے ہوئے کتنا روئی تھیں۔ جلد ہی دوبارہ اس شہر میں ٹرانسفر کرا لینے کی یقین دہانی کرانے پر ہی پاپا ممی کو اپنے ساتھ لے جا سکے تھے۔ اکلوتا بیٹا ہونے کے ناطے وہ دادی کے ساتھ رُک گیا تھا۔

''کافی؟'' بوڑھی عورت نے چشمے کے پیچھے سے دیکھتے ہوئے اپنا کافی کا پیالہ ہونٹوں سے لگا لیا۔

''نو تھینکس! ابھی ہم خود بنالیں گے۔'' ہنری اسے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کر کے واش بیسن پر منہ دھونے چلا گیا۔ بوڑھی عورت چپ چاپ کافی کی چسکیاں لیتی رہی۔ اوڈین نے ہی پہل کی —— ''آپ مسز ہنری ہیں؟''

''او، یس۔'' ایک لاتعلق سا جواب۔ وہ شرمندہ ہو اُٹھا۔

''کتنے بچے ہیں آپ کے؟'' وہ طویل خاموشی سے گھبرا رہا تھا۔ کسی حد تک ایک بھارتی دل کی ناشائستگی سے بھی۔ ایک ساتھ ہوں اور اس قدر سرد مہری کہ ایک دوسرے کا حال بھی نہ پوچھ سکیں۔

''چار ہیں۔ دو میرے اور دو مسٹر ہنری کے۔'' وہ کافی کی چسکی لیتے ہوئے بولی۔

''سب آپ کے ساتھ ہی ....؟'' پوچھتے ہوئے اسے خود بھی کچھ عجیب سا لگا تھا۔

''کیا مطلب؟ میرے ساتھ؟ کیوں؟'' کئی سوال اسی نے اس کی طرف اُچھال دیے۔ وہ انھیں لپکنے کی کوشش کرنے لگا۔

''مطلب، آپ لوگ کب ایک ساتھ ہوتے ہیں؟ کسی خاص موقع پر؟''

''نہیں، جب کسی کی موت ہوتی ہے۔'' وہ حسب سابق لاتعلق سی بیٹھی رہی۔ ہنری صاحب رومال سے ہاتھ پونچھتے ہوئے آ کر اس کی بغل میں بیٹھ گئے۔

یکا یک پیچھے والی گاڑی کے ہارن کی آواز سے وہ چونک پڑا۔ وہ دونوں لڑکیاں اب بالکل سامنے آ گئی تھیں۔ انھیں بہت سنبھل سنبھل کے چلنا پڑ رہا تھا۔ شاید انھیں اپنے پیروں کی چپلیں پانی میں بہہ جانے کا خدشہ تھا۔ پھر آتے جاتے رکشے اور سائیکل سوار، ایک قدم بھی

بڑھنے دیں تب نا! اس نے ٹیپ بند کر دیا اور کہنی کو کار کی کھڑکی پر ٹکائے، پاؤں پسار کر لیٹ گیا۔ شاید بہت دور تک ٹریفک جام تھا۔ آگے سڑک کے بائیں جانب کیبل بچھانے کے لیے دور تک کھدائی کی گئی تھی۔ گڑھے پاٹنے سے پہلے موسلا دھار بارش ہو جانے کی وجہ سے مٹی بہہ کر پوری سڑک پر پھیل گئی تھی۔ کنارے کٹے ہونے کی وجہ سے آنے جانے والی دو بڑی گاڑیوں کا بیک وقت گزرنا دشوار تھا۔ شاید یہاں کوئی پولس چیک پوسٹ تھا۔ سامنے لوہے کے لال جالی نما کئی بیریئر رکھے ہوئے تھے۔ ادھر سے آنے والے ایک سائیکل سوار کو روک کر اس نے پوچھا،

''بھائی صاحب، ٹریفک کی کیا پوزیشن ہے؟''

''ابھی کم سے کم ایک گھنٹے سے پہلے پار نہیں ہو پائیں گے۔ ٹرک پھنس گیا ہے۔''

اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کی گاڑی کے پیچھے دور تک نہ جانے کتنی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ سڑک کے ڈیوائڈر کے پاس کھڑے ہونے کی وجہ سے وہ اپنی گاڑی کو موڑ کر دوسری جانب سے واپس بھی نہیں جا سکتا تھا۔ تھک ہار کر اس نے دوبارہ کار کی کھڑکی پر کہنی ٹکائی اور اپنے آپ کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔

وہ دونوں اب ہنس رہی تھیں، شاید اسکرٹ والی لڑکی کے یکبارگی لڑکھڑا جانے کی وجہ سے۔ وہ بھی مسکرا اُٹھا۔ کہیں وہ گر ہی پڑتی تو؟ پورا اسکرٹ پانی سے تر ہو کر جانگھوں سے چپک جاتا اور چلنے پر پھٹ پھٹ کی آواز ہوتی۔ ٹیری کاٹ کے کپڑوں کے پانی میں بُھیگ جانے پر ان کا ملائم پن ہلکے کڑے پن میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اس لڑکی نے نیلی اسکرٹ پر گلابی رنگ کا کھلے گلے والا ٹی شرٹ پہن رکھا تھا جو بارش میں بھیگ کر اس کے اندرونی کپڑوں کے ساتھ چپک گیا تھا۔ گھٹنے سے نیچے تک کی ٹانگیں کھلی تھیں۔ ساتھ والی لڑکی اس کی ہم عمر تھی یعنی بیس پچیس سال کی۔ پیلے بارڈر والی گہرے سرخ رنگ کی ہینڈلوم کی ساڑی اور اسی سے میل کھاتا بلاؤز پہنے ہوئے وہ دوشیزہ سامنے سے اپنی ساڑی کی تہوں کو دائیں ہاتھ کی مٹھی میں دبائے، پاؤں اوپر اٹھانے کے ساتھ تھوڑا نیچے چھوڑ دیتی اور پاؤں پانی میں پڑتے ہی ساڑی کو تھوڑا اوپر اُٹھا لیتی تا کہ پانی اور کیچڑ میں لتھڑ کر چوپٹ نہ ہو جائے۔ اس عمل کے دوران بار بار اس کی پنڈلیاں کھل

جاتیں جو بڑی دلکش لگ رہی تھیں۔ اؤدین کی نگاہیں اسکرٹ والی لڑکی سے ہٹ کر ساڑی والی لڑکی پر ٹک گئی تھیں۔ اسکرٹ والی لڑکی کی مستقل کھلی پنڈلیوں میں اسے کوئی کشش محسوس نہیں ہورہی تھی۔

''ارے رے، سنبھل کے نندنی۔'' اس بار ساڑی والی لڑکی پانی میں لڑکھڑائی تو اسکرٹ والی لڑکی نے اسے جھپٹ کر پکڑ لیا۔ دونوں ایک دوسرے کو سنبھالنے میں لہرا گئیں۔ ساڑی والی لڑکی کے چہرے پر ایک خجالت آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ اس نے اپنا سر جھکالیا۔

''اچھا، تو اس کا نام نندنی ہے۔ دوسری والی ضرور نینسی ہوگی۔ اسکرٹ میں جو ہے۔'' وہ دل ہی دل میں ہنس پڑا۔ نینسی اسی کے ساتھ نیویارک ہاسپٹل میں اسٹاف نرس تھی۔ ہمیشہ اسکرٹ اور شرٹ میں چاق و چوبند رہنے والی نینسی ذرا باتونی تھی۔ اسی لیے اؤدین کو اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ وہی تو ایک تھی جو تھوڑا وقت نکال کر اؤدین کے دیس اور گھر کے بارے میں کچھ پوچھ لیتی تھی اور وہ اسے بتانے کے بہانے سے سب کو یاد کرلیا کرتا تھا ورنہ کسی کو کسی کے لیے فرصت ہی کہاں تھی؟

ایک بار نینسی کے اسکرٹ کی سلائی پیچھے کی جانب اُدھڑ گئی تھی اور اس کی بھوری پینٹ دِکھائی دینے لگی تھی۔ اؤدین کو جھجک محسوس ہورہی تھی۔ سب لوگ دیکھ رہے تھے۔ بے چاری نینسی کو شاید پتہ نہیں تھا ورنہ وہ کتنا شرمندہ ہوتی۔ اؤدین نے پریشان ہوکر ایک چٹ پر لکھ کر دھیرے سے نینسی کو پکڑا دیا —— ''کیئر یور کلاتھ۔''

''اوہ! آئی نو اؤدین۔ اب اسے استعمال نہیں کروں گی۔ پہنتے وقت بھی سوچ رہی تھی۔ اسے اب پھینک دینا پڑے گا کیونکہ یہاں ریپئرنگ چارج بہت زیادہ ہے۔ اتنے میں نیا ڈریس آجائے گا۔'' اس نے بالکل معمول کے انداز میں کہا، جیسے اس میں کوئی برائی نہیں تھی۔

اس بار وہ گھر آیا تو روزانہ کوئی ایک واقعہ یاد کرکے ممی اور دادی کو سناتا۔ وہ دونوں ہی ہنس ہنس کر دہرے ہوجاتے۔

''پگلا کہیں کا۔ کیوں اسے صلاح دینے گیا؟''

''کہہ دینا تھا تھوڑا اور پھاڑ لو مہارانی۔'' اماں ہنستی ہوئی منہ پھیر کے پاپا کے لیے پان بنانے لگی تھیں۔

''دل ہی نہیں لگتا تھا وہاں۔ ہمیشہ کام، بس کام یا پھر اکیلے بیٹھ کر کچھ پڑھو لکھو، یاد کرو۔ تمھاری بہت یاد آتی تھی دادی۔'' وہ دلار کے مارے دادی کی گود میں لیٹ گیا۔

''ارے میرے لال، کیسے دن کاٹے ہیں تیرے بنا۔'' دادی بے چین ہوکر اس کے بال سہلانے لگیں۔

''یہ لو، جیسے ہم لوگ تھے ہی نہیں ان کے پاس۔'' پاپا نے چٹکی لی۔

''ارے، تم تھے لیکن یہ تو نہیں تھا نا! سب کی اپنی اپنی جگہ ہے، اہمیت ہے۔'' دادی نے دلیل دی۔

''ارے، اسی لیے تو بھاگ آئے صاحبزادے اتنی اچھی نوکری چھوڑ کر۔ لوگ باہر جانے کے لیے کیسے کیسے ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور ایک یہ ہے کہ ان کا دل ہی نہیں لگا۔'' پاپا جھوٹ موٹ کا چڑاتے ہوئے بولے۔

''کیا آپ کا دل لگتا تھا پاپا؟''

''تمھارے مستقبل کے لیے دل کو سمجھا لیتا تھا لیکن جب اپنے بارے میں سوچتا تھا تو بے چین ہو جاتا تھا۔ کہیں مجھے کچھ ہوگیا تو تمھیں آتے آتے بھی ہفتوں لگ جائیں گے۔ آخری دیدار بھی کر پاؤ گے کہ نہیں؟'' پاپا جذباتی ہو گئے تھے۔

''پاپا، پلیز! ایسی باتیں نہ کریں۔'' وہ بھی جذباتی ہو اُٹھا۔ وہ پاپا اور ممی کے بغیر زندگی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیسی عجیب تھی لارینجن کی آتما جو اپنے باپ کی موت کی خبر سن کر بھی سوئی رہی۔ رات میں اسی کی ڈیوٹی تھی اس دن۔ لارینجن شام کو اپنے باپ کو دیکھنے آیا تھا اور آدھے گھنٹے کے بعد ہی واپس چلا گیا تھا۔ کہیں 'نیوز' میں شفٹ ڈیوٹی تھی۔ آدھی رات کے بعد اس کے والد کی حالت کنٹرول سے باہر ہوگئی۔ دوبارہ دل کا تیز دورہ پڑا تھا۔ ایک سینئر ڈاکٹر کے ساتھ وہ خود بھی آخری اُمید تک کوشش کرتا رہا لیکن بچا نہیں سکا تھا۔ سینئر ڈاکٹر نے دستانے اور ماسک

اُتارے اور سر جھکائے باہر چلا گیا۔ آگے کی کارروائی نرس اور وارڈ بوائے کے ذمے تھی۔ اسے بہت دُکھ ہوا۔ آخری لمحے میں باپ کے منہ سے درد بھری آواز میں بیٹے کا نام نکلا تھا۔ اسے خبر دینی چاہیے۔ ڈھونڈ کر لارینجن کا فون نمبر لیا اور رات ہی میں اسے اطلاع دے دی ——

"ویری سوری مسٹر لارینجن۔ آپ کے والد کا انتقال ہوگیا۔ ہم لوگوں نے بہت کوشش کی لیکن...." اس نے دُکھ بھری آواز میں اپنی ہمدردی کا اظہار کیا۔

"جی، آپ اسے کولڈ کاٹیج میں رکھوا دیجیے۔ میں صبح آؤں گا تو باقی کارروائی کرلوں گا۔"

اسے تعجب ہوا اور اس مشینی تہذیب پر افسوس بھی۔ یہ جگہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔ یہاں تو اچھا خاصا آدمی بھی پاگل ہوجائے گا۔ چھی .... اپنوں کے لیے درد نہیں ہے تو دوسروں کے لیے کیا ہوگا؟ بھارتی دل روبوٹ میں فٹ نہیں ہوسکتا۔ اس نے دل ہی دل میں لارینجن کو برا بھلا کہا اور فون رکھ دیا۔

ممی کو جب اس نے اس حادثے کے بارے میں اور دوسرے دن کورٹ کا سمن جاری ہونے اور لارینجن کی نیند خراب کرنے کی وجہ سے مجرم ٹھہراتے ہوئے جرمانہ وصول کیے جانے کی بات بتائی تو ممی بھڑ اُٹھی تھیں۔ "توبہ، کیسی ہے وہاں کی زندگی —— ؟ باپ مر جائے اور بیٹے کو نیند ستائے۔ ایک تو خبر دی، اُلٹے جرمانہ بھی بھرا۔"

"اتنا ہی نہیں ممی، وہاں تو بیٹے کو مارنا بھی ایک جرم ہے۔ ماں باپ اپنے بچے کو ایک تھپڑ بھی ماردیں اور بچہ پولس میں رپورٹ کردے تو ان کے خلاف کارروائی ہوجاتی ہے۔"

"جانے دے۔ بھگتیں گے وہ لوگ۔ اچھا کیا جو تو لوٹ آیا۔" دادی نے اپنی چندن والی مالا گلے میں سے نکال کر ہاتھ میں لے لی۔

"دھیرے دھیرے وہ ہوا یہاں بھی پہنچ رہی ہے۔" پاپا نے مدھم آواز میں کہا۔

اسے یاد آیا اپنے ہی اسپتال میں بھرتی ہونے والا ادھیڑ عمر کا 'سہتو'۔ ترقی پاتے پاتے وہ اسٹور کیپر بن گیا تھا۔ مریضوں کی چادریں، کمبل اور اسپتال کے پردے وغیرہ کی دھلائی کروانا اور اس کا حساب رکھنا اس کا کام تھا۔ دھویں، دھول اور ٹھنڈک سے الرجی نے نہ جانے کب دمہ

کی خطرناک صورت اختیار کرلی تھی اور اس کے سینے کو کھوکھلا کردیا تھا۔ کئی بار اسی اسپتال میں بھرتی ہوچکا تھا۔ آکسیجن تک چڑھانے کی نوبت آچکی تھی۔ اینٹی الرجی دوائیں اب اس پر بے اثر ہوچکی تھیں۔ سیڑھیاں چڑھتے اُترتے وہ ہانپتا تھا۔ چہرے پر ایک طرح کا کھنچاؤ مستقل طور پر دِکھائی دیتا تھا۔ ذرا سا موسم بدلتے ہی سینے کی جکڑن اور سانس کی تکلیف بڑھ جاتی۔ اس بار مانسون چپکے سے ذرا پہلے ہی آپہنچا تو سہتو' کو احتیاط کرنے کا موقع بھی نہیں ملا۔ شدید گرمی کے بعد یکایک ہوا میں نمی اور ہلکی سی ٹھنڈک نے لوگوں کو راحت پہنچائی تھی لیکن سہتو' کا سینہ بالکل جکڑ گیا۔ دمہ کا ایک خطرناک دورہ پڑا جس کی وجہ سے اسے اسپتال میں داخل کرنا پڑا۔ اس دن شام کی ڈیوٹی پر وہی تھا۔ آکسیجن دینے کے بعد بھی جب سہتو' کی حالت میں کوئی خاص افاقہ نہیں ہوا تو اس نے اسے جنرل وارڈ سے نکال کر آئی سی یو (اِن ٹینسیو کیئر یونٹ) میں ٹرانسفر کروادیا۔ کمرے کا درجۂ حرارت سہتو' کی صحت کو دھیان میں رکھتے ہوئے معمول سے تھوڑا زیادہ کردیا تاکہ سینے کی جکڑن کچھ کم ہو اور ہلکی گرمی سے اس کے عارضے میں کچھ افاقہ ہوسکے۔ ویسے ڈاکٹر تیواری نے کہہ دیا تھا کہ اس کے بچنے کی اُمید نہیں ہے۔

''دیکھو اؤدین، تم پوری کوشش کرلو۔ ایک ڈاکٹر کا فرض ہے لیکن مریض کی آواز بالکل ختم ہوگئی ہے۔ سانس لینے میں اسے جتنی تکلیف ہے تم دیکھ ہی رہے ہو۔ پھر بھی یو ٹرائے یور بیسٹ۔''

''تھینک یو سر! ہمیں اس کی آخری سانس تک کوشش کرنی چاہیے۔ آگے تو سب کچھ ایشور کے ہاتھ میں ہے .... آخر وہ ہمارے اسٹاف کا ہے۔''

''ہاں، بہت پرانا۔ بے چارہ اگلے ہی برس ریٹائر ہونے والا ہے۔''

''کا ساہب، نا بچیہے کا؟ ہمار سُہاگ بچالا ڈاکٹر ساہب۔ ہم عُمر بھر تو ہار گلامی کرب۔''

ایک عورت اس کے قدموں میں جھک کر لپٹ گئی تھی۔ اؤدین چونک پڑا۔ شاید وہ پیچھے کھڑی ہوکر ڈاکٹر تیواری اور اس کی باتیں سن رہی تھی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہی سہتو' کی پتنی تھی۔ اؤدین نے بہت نرمی سے اسے سمجھایا —— ''دیکھو، حالت تو بہت گمبھیر ہے لیکن ہم پوری کوشش کریں گے بچانے کی۔ آخر ہمارے اسٹاف میں ہے سہتو' اور اسپتال کے سارے لوگ ایک

خاندان ہیں۔ ہم کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے۔ تم فکر نہ کرو۔ بس بھگوان سے پرارتھنا کرو کہ وہ تمھارے پتی کو ٹھیک کردے۔ ہم تو بس اپنا کام کرتے ہیں۔ مالک تو وہی ہے نا۔'' اس کے چہرے پر مایوسی اور دُکھ کے جذبات تھے اور وہ اس کی جانب پلکیں جھپکائے بغیر دیکھ رہی تھی۔

''اچھا صاحب، اگر بابو کو کچھ ہوجاتا ہے تو مائی کو پنشن کے ساتھ ساتھ مجھے ان کے وارث کے روپ میں نوکری مل جائے گی نا یہاں؟ بڑا لمبا پریوار ہے صاحب ہمارا اور کماؤ کیول بابو۔ چار میرے بچے اور تین بہنیں۔''

اؤدین نے اس بار چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ ایک لمبا سانولا لڑکا گلے میں گچھا لپیٹے، کالی پینٹ اور سفید شرٹ اور پیروں میں نارتھ اسٹار کے بھاری بھرکم، کیچڑ اور گندگی میں لتھڑے ہوئے بدرنگ جوُتے پہنے، اس سے بڑی ہی سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔ اس کے جسم سے پسینے کی بدبو خارج ہورہی تھی۔ اؤدین کا دل اس کی اندرونی اور باہری گندگی پر بِھنّا اُٹھا۔ اس نے حیران ہوکر پوچھا— ''تم کون ہو؟''

''یہ ہمارا آدمی ہے ساہب۔ ان کا اکلوتا لڑکا ہے۔ ابھی تک نوکری نہیں پایا ہے۔ ہائی اسکول پاس ہے، تب بھی۔''

جواب اس کے بغل میں کھڑی ہوئی دائی نے دیا تھا جو کبھی کبھی اسپتال میں جھاڑو پونچھا کرنے کے لیے بدلی پر لگائی جاتی تھی۔

''اچھا تو تم سہتوُ کے لڑکے ہو اور یہ تمھاری پتنی ہے؟'' اؤدین نے وضاحت چاہی۔

''جی ساہب۔ اب مجبوری میں اسے جھاڑو پونچھا کرنا پڑتا ہے۔ گھر کا خرچا بھاری ہے۔ نوکری آج کے زمانے میں....''

''لیکن نوکری ہی کیوں کرنا چاہتے ہو؟ دوسرے کام بھی تو ہیں۔ کام کی کمی نہیں دنیا میں۔ بس محنت کرنے کی لگن ہونی چاہیے۔'' اؤدین نے اسے لتاڑا۔

''لیکن ساہب سرکاری نوکری میں کوئی خطرہ نہیں رہتا نا۔ نوکری سے کوئی ترنت ہٹا نہیں سکتا نا۔'' اس کے چہرے پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ تیر گئی تھی۔ اس کی ماں پریشان سی کبھی بیٹے کو تو

پریم چند کی روایت کو وشومبر ناتھ کوشک اور پنڈت سدرشن نے آگے بڑھایا۔ سدرشن نے ۱۹۲۳ء میں پہلی ہندی کہانی 'کوی کی اِستری' لکھی تھی لیکن انھیں 'ہار کی جیت' (۱۹۲۵ء) سے شہرت ملی۔ پنڈت کوشک نے اپنی کہانیوں میں سماجی مسائل کو موضوع بنایا اور کرداروں کی نفسیاتی اُلجھنوں کو بھی پیش کیا۔ پریم چند کو آدرش ماننے والوں میں اچاریہ چتر سین شاستری، رام برکش بنی پوری، گووِند ولبھ پنت، جوالا دت شرما، سیارام شرن گپت، برندابن لال وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

جے شنکر پرساد جذباتی اور نفسیاتی کہانیوں کے جنم داتا ہیں۔ ان کی کہانیوں کا موضوع وہ انسان ہے جو زندگی کے سنگین حقائق، عمل و ردِّعمل، ذات برادری کے بھید بھاؤ سے اوپر اُٹھ کر انسانیت کا محافظ ہے۔ پرساد جی سے متاثر ہونے والے افسانہ نگاروں میں رائے کرشن داس، ونود شنکر ویاس اور چنڈی پرساد 'ہردییش' کا شمار ہوتا ہے لیکن ان فنکاروں پر پریم چند کا بھی اثر ہے۔

پریم چند کے بعد کہانی نے جب نیا موڑ لیا تو اس کی بنیاد واقعہ نگاری کی بجائے نفسیاتی تجربے پر رکھی گئی۔ اس روایت کے علمبردار جینندر جی ہیں۔ انھوں نے اپنی کہانیوں میں انسانی دل کی گہرائیوں اور فرد کے اندرون کو کھنگالا اور کردار کے باطن کی پرتیں کھولیں۔ 'کھیل'، 'سادھو کا ہٹ'، 'ایک رات'، 'بلی کا بچہ' وغیرہ ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔

اس دور میں خواتین بھی افسانے لکھ رہی تھیں جن میں اوشا دیوی مترا اور ستیہ وتی ملک قابلِ ذکر ہیں۔ انھوں نے عورتوں کے دلی جذبات کی بڑی خوبصورت عکاسی کی ہے۔

اسی عہد میں اگیے (अज्ञेय) نے نفسیاتی کہانیاں لکھیں۔ ان کی بعض کہانیوں پر فرائڈ اور ایڈلر کا اثر نمایاں ہے، مثلاً 'پولس کی سیٹی' پر فرائڈ اور 'دیوی سنگھ' پر ایڈلر کا۔ وِپتھگا، پرمپرا، کوٹھری کی بات، شرنارتھی، اگیے جی کی کہانیوں کے مشہور مجموعے ہیں۔

اگیے جی کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں بھگوتی پرساد باجپئی اور ایلا چندر جوشی قابلِ ذکر ہیں۔ باجپئی جی نے اپنی کئی کہانیوں میں نوجوانی کے جذبات کی بھرپور عکاسی کی ہے۔ جوشی جی نے اپنی کہانیوں میں کرداروں کی نفسیات کو اُجاگر کیا ہے۔

نفسیاتی رجحان نے ہندی افسانوں کو پریم چند کی کہانیوں سے دور کر دیا تھا۔ اسے دوبارہ

کبھی اؤدین کو دیکھ رہی تھی۔ اؤدین نے بات ختم کرتے ہوئے کہا——

''لیکن ابھی سے اتنا مایوس ہوکر سوچنے کی کیا ضرورت ہے؟ میں نے 'سہتو' کو آئی سی یو میں شفٹ کردیا ہے۔ اے سی میں تھوڑا ٹمپریچر مینٹین ہوگا تو شاید آکسیجن بھی اپنا اثر دِکھائے۔ ہوسکتا ہے وہ ٹھیک ہی ہوجائے۔ کیوں برا سوچتے ہو؟''

''ویسے بھی تو ایک ہی سال اب ان کی نوکری بچی ہے ساہب۔ اس کے بعد تو...''

''بہت گرے ہوئے انسان ہو جی تم۔ اپنے باپ کے بارے میں اس طرح سوچ رہے ہو! شرم نہیں آتی تمھیں۔''

اؤدین غصّے میں وہاں سے ہٹ گیا۔ کیسے کیسے لوگ ہیں یہاں! اکھلیش کی بات اس وقت بھی یاد آئی تھی لیکن دل ہی دل میں اؤدین نے اسے دوبارہ رد کردیا—— نہیں، 'سہتو' کا لڑکا جاہل ہے، اس لیے بنا سوچے سمجھے بول گیا ہوگا۔

دوسرے دن صبح وہ ڈیوٹی پر پہنچا ہی تھا کہ آئی سی یو کے سامنے سے چیختی ہوئی سہتو کی بیوی آکر اس کی ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی۔

''ساہب، چل کے دیکھا۔ ان کر سنسیا .....'' وہ دوڑ کر آئی سی یو میں داخل ہوا تو پورے بدن میں ٹھنڈ سے کپکپاہٹ سی دوڑ گئی تھی۔ یکبارگی اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا بات ہے؟ سامنے بیڈ پر 'سہتو' کی رک رک کر چلتی ہوئی سانس گھر گھر کی آواز کے ساتھ جیسے آخری سفر کی تیاری میں سب کچھ سمیٹ رہی تھی۔ یکایک اؤدین کو یاد آیا تو وہ سسٹر پر برس پڑا——

''کس نے اے سی کی کؤلنگ بڑھائی؟ میں تو وارمر پر رکھ کے گیا تھا۔ بولو....'' غصّے میں اس کے نتھنے پھڑک رہے تھے اور وہ جھپٹ کر سہتو کے سینے پر اپنی دونوں ہتھیلیوں سے دبا دبا کر پمپ کرنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ وہ آخری کوشش تھی۔ نرس سہمی سہمی سی بول رہی تھی——

''سر، کسی نے نہیں بڑھایا سر۔ اے سی ٹھیک چل رہا تھا سر۔''

''تو کیا کوئی بھوت پریت آکر وارمر سے کؤلر کی طرف ناب گھما گیا؟'' اؤدین اب بھی غصّے میں تھا۔ سہتو نے آخری ہچکی لی تو اؤدین مضطرب ہوکر کھڑا ہوگیا۔ اس کی ساری کوششیں

رائیگاں ہوگئی تھیں۔ کچھ دیر کے لیے اسے اپنے آپ پر ہی شک ہونے لگا کہ کہیں اسی نے تو غلطی سے گرم کرنے کی جگہ .... نہیں نہیں ..... اس نے تو کچھ دیر اے سی کے سامنے اپنی ہتھیلی رکھ کر ٹمپریچر کا جائزہ بھی لیا تھا۔ یہ اس کی غلطی ہرگز نہیں تھی۔ دوپہر تک اس کا دل بہت افسردہ رہا۔ اسی وقت نرس گھبرائی ہوئی آئی اور بتایا——

"سر، سر، ایک بات سے مجھے شک ہو رہا ہے۔ وہ سہتو کا لڑکا رو رہا تھا تو اس کی عورت اسے دھیرے دھیرے سمجھا رہی تھی۔ میں نے کھمبے کی آڑ سے سنا تھا سر۔"

"کیا؟" اوُدین کو بھی تجسّس ہوا۔

"اس کی عورت کہہ رہی تھی کہ اس میں پچھتانے کی کیا بات ہے؟ آج نہیں تو کل بڑھو کو جانا ہی تھا۔ ایسی بیماری تو تھی نہیں کہ علاج سے ٹھیک ہو جاتی۔ اب غلطی سے بھی اپنی یہ بات اور کسی کے سامنے مت قبول دینا۔"

"تمھیں یہی بات پولس کے سامنے اور ضرورت پڑی تو کورٹ کے سامنے بھی کہنی ہوگی سسٹر۔ میرا ساتھ دوگی نا سسٹر؟ اس طرح کی بے حسی کو ابھی نہ کچلیں گے تو یہ ہم سب کے لیے خطرناک ہو جائے گا۔ پھر کوئی دوسرا بھارت بھی نہیں ہے دنیا میں، جہاں جاکر چین کی سانس لے سکیں گے اور رشتوں کی خوشبو کو دل میں اُتار سکیں گے۔"

"جی سر۔ میں تیار ہوں۔" نرس، اوُدین کے خیالات سے متاثر تھی۔

"تو اس گواہ کو بھی ڈھونڈو جس نے سہتو کے لڑکے کو آئی سی یو میں جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"ٹھیک ہے سر۔ میں پوری کوشش کروں گی۔"

"بھائی صاحب! گاڑی آگے بڑھائیے۔ جام کھل گیا ہے۔ اسٹارٹ نہ ہو رہی ہو تو دھکا لگاؤں۔ برسات میں انجن ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔"

اوُدین پیچھے والی گاڑی کے ڈرائیور کی آواز سن کر چونک پڑا۔ چیک پوسٹ کے پاس سے ہوکر گاڑیاں نکل رہی تھیں۔ اس کی کھڑی ہوئی گاڑی کے سامنے سے وہ دونوں لڑکیاں اب سڑک پار کرکے صحیح سمت میں پہنچ چکی تھیں۔

راستے کی چبھن

چھِنّی اپنی کوٹھری میں پہنچی تو اندھیرا ہو چکا تھا۔ اس کے اپنے اندر چھائے ہوئے گھٹاٹوپ اندھیرے ہی کی طرح سیاہ، بھائیں بھائیں کرتا ہوا اندھیرا۔ اس اندھیرے میں اس کی کوٹھری کی مٹی کی دیوار کالے پلاسٹک کی شیٹ پر رکھے جھینگے کی طرح دھندلی سی دِکھائی دے رہی تھی۔ اس نے نتھکی کی اُنگلی چھڑاتے ہوئے ٹارچ جلا کر کوٹھری کے دروازے کی جانب دیکھا۔ چھوٹا سا تالا اس کے گھر کی رکھوالی میں چپ چاپ لٹکا ہوا تھا۔ اس نے ٹارچ بجھا دی۔ بلا وجہ بیٹری کیوں خرچ کرے۔ پرسوں کالی چرن کاکا کے یہاں ناگ بابا دِکھائی نہ دیے ہوتے تو وہ اتنا پیسہ فضول خرچ نہ کرتی۔ اپنی پروا نہ بھی کرے لیکن چھوٹی سی جان نتھکی کی پروا تو کرنی ہی ہے۔ کہیں اندھیرے میں رفع حاجت کرتے ہوئے کوئی ڈس وس لے تو ..... وہ آگے کی بات سوچنا نہیں چاہتی تھی اس لیے اس نے اپنے خیالات کو جھٹک دیا اور مچھلیاں بیچ کر لوٹتے ہوئے اس نے ٹارچ خرید لی۔

''اماں، جلاؤ نہ لیٹ۔''

اندھیرے سے گھبرا کر نتھکی نے ماں کو ٹھوکا دیا۔

''ہاں، لے ذرا اسے جلا کر تو پکڑ۔ میں بھگّو بابا کو ہاتھ جوڑ لوں۔''

نتھکی روشن ٹارچ لیے ماں کی جانب رُخ کیے کھڑی ہو گئی۔ چھِنّی نے سر پر آنچل رکھا اور کوٹھری کی بغل میں ہاتھ جوڑ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔

''.....دہائی بھگو بابا کی .....''

آگے کے لفظ سنائی نہیں دیے۔ اس کی کوٹھری کے پیچھے کچھ دوری پر کھڑا برگد کا بڑا سا درخت اور اس کی لٹکتی ہوئی بے شمار جڑیں اندھیرے میں اور بھی زیادہ بھیانک لگ رہی تھیں۔ ایک ننھا دِیا جڑوں کے پاس ٹمٹما رہا تھا۔ شاید کوئی جلا گیا تھا۔ خوف اور اعتقاد میں کشمکش ہو رہی تھی۔ صدیوں سے یہی ہوتا آیا ہے۔

چِھپُنی نے سر اُٹھایا۔ ڈبڈبائی آنکھوں سے بھگو بابا سے کچھ کہا اور اپنے دروازے کی طرف لوٹ آئی۔ اس کا روز کا یہی معمول تھا۔ بازار سے مچھلی بیچ کر لوٹنے پر وہ اپنے دروازے ہی پر کھڑے ہو کر بھگو بابا کو ہاتھ جوڑ لیتی۔ یہیں سے درشن ہو جاتا۔ کبھی کبھی وہ بھی دِیا جلانے چلی جاتی لیکن صاف ستھری ساڑی پہن کر۔ بِساندھ بؤ میں بسی ساڑی پہن کر بابا کے پاس کیسے جایا جا سکتا ہے اور اس کی ساڑی تو روز ہی شام ہوتے ہوتے مچھلی کی بساندھ سے مہکنے لگتی تھی۔ سر پر رکھے مٹکے میں مچھلیوں کی اُچھل کود سے پانی چھلک چھلک کر اس کے پورے جسم کو بھگوتا رہتا تھا۔

تالا کھول کر اس نے ننھکی کے ہاتھ سے ٹارچ لے لیا۔ ڈھونڈ کر دیا سلائی نکالی اور دِیا جلا کر طاق میں رکھ دیا۔ چولھے کی طرف دیکھا۔ دوپہر کی بجھی ہوئی ادھ جلی لکڑی پڑی تھی۔ کھانا پکانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ دوپہر کی بچی ہوئی دو روٹیاں اور سرسوں کے مسالے والی رسدھری مچھلی کڑھائی میں ڈھکی ہوئی رکھی تھی۔ اس نے کڑھائی سمیت اسے ننھکی کے آگے زمین پر رکھ دیا۔

''لے تو کھا لے۔ میں بچھونا لگا دوں۔''

''اماں، تو نہیں .....'' تین برس کی ننھکی نے ماں کی طرف حیرت سے دیکھا۔

''نہیں، میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ میں نہیں کھاؤں گی۔ تو کھا کر ہاتھ منہ دھو لے۔''

چِھپُنی نے کونے میں کھڑی ہوئی چارپائی کو دھیرے سے زمین پر گرا دیا۔

''کیوں، جی نہیں اچھا اماں؟ .....وہاں سادھو بابا کو جو ڈانٹ پلائی تھی اسی لیے .....''

ننھکی باتوں کے ذریعے اماں کی خاموشی کو توڑنا چاہ رہی تھی۔ راستے بھر اماں چپ تھی۔ نہیں تو روز بازار آتے جاتے وہ اس سے کچھ نہ کچھ باتیں کرتی رہتی تھی۔ کبھی باؤلی کی چڑیل کے

بارے میں، تین راستے پر کیے گئے ٹونے کے بارے میں تو کبھی اسے اگلے سال اسکول بھیجنے کی تمام تیاریوں کے بارے میں۔ چک روڈ پر اماں آگے آگے پانی سے بھرا ہوا مچھلیوں کا مٹکا لیے ہوئے چلتی رہتی اور پیچھے پیچھے ہکاری بھرتی ہوئی نھکی۔ کبھی کبھی پانی چھلک کر نھکی کے اوپر آ گرتا تو وہ اماں سے تھوڑا پیچھے ہوجاتی لیکن کچھ ہی دیر میں اماں کی کہانیوں کی چڑیل کے ڈر سے وہ پھر اماں سے لگ کر چلنے لگتی۔ لیکن آج نہ تو لماں مچھلی بیچنے گئی اور نہ ہی لوٹتے وقت راستے میں کوئی کہانی سنائی۔ جاتے وقت گاؤں کی منتی کاکی، بڑھیا ایا، للیا، دیپوآ، مہتابی پھوا، سُدا ماموسی، بدمیا، بڑکی مائی، بھولا ممّا سب تھے لیکن لوٹتے وقت اماں اسے لے کر اکیلے ہی چل دی تھی۔

نھکی حیران تھی۔ جب سبھی لوگ سادھو بابا کی باتیں سن رہے تھے تو اماں ہی کیوں غصہ ہوگئی تھی۔ کیوں اس نے سادھو کو ڈانٹا تھا پھر غصّے میں بڑبڑاتی ہوئی اُٹھ کر چلی آئی تھی۔ وہ بار بار اماں کے چہرے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ راستے میں کئی بار اس نے اماں کو آنچل سے اپنی آنکھیں پونچھتے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

"کھا چکی تو آ سو جا....."

چھٹنی نے چارپائی پر گدڑی بچھاتے ہوئے نھکی کی طرف دیکھا۔ نھکی جلدی جلدی ہاتھ منہ دھوکر آئی اور بچھونے پر لیٹ گئی۔ چھٹنی نے دروازے کی کنڈی اندر سے بند کردی اور ٹارچ کو سرہانے رکھ کر دِیے کو آنچل سے بجھا دیا۔ کوٹھری میں گہرا اندھیرا پھیل گیا۔ باہر برساتی کیڑوں کی آوازیں رات کے سناٹے کو توڑ رہی تھی۔ چھٹنی آ کے نھکی کی بغل میں لیٹ گئی۔ نھکی کے سر پر ہلکی ہلکی تھپکی دیتے ہوئے اس کا دل اِدھر اُدھر بھٹک رہا تھا۔

"اچھا ہوا جو اس نے آج بھری سبھا میں اس کا پانی اُتار دیا۔

سادھو ..... ہؤں ..... کیا تھا ..... فادری بنا ہے ..... دوسروں کو دھرم سکھانے آیا ہے۔ ..... ای کرو ..... اؤ کرو ..... خدا بھلا کرے گا ..... لگتا ہے خدا اسے مل کے آیا ہے ..... ڈھونگی کہیں کا ..... بھگوڑا ..... اپنا دین دھرم بدل لیا تو سب لوگوں کا دھرم بدلنے آیا ہے ..... سب کے خاندانوں کو ڈسے گا ..... ناگ کہیں کا ....."

چھپُنی نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ ذہن کو دوسری جانب متوجہ کرنے کی کوشش کی —— بس چار سال پہلے۔ چار سال پل بھر میں کھسک کر اس کے پاس آ گئے۔ ماضی، حال معلوم ہونے لگا۔

’’کیا نام ہے تیرا؟‘‘

جال میں ہاتھ ڈال کر مچھلیاں پکڑتے ہوئے اس نے پوچھا تھا۔

ہرے رنگ کی ساڑی کو گھٹنوں کے اوپر تک کھونسے ہوئے، دونوں ہاتھوں سے جال پکڑے ہوئے وہ آنکھیں گھما کر مسکرا اُٹھی۔

’’بتا نا، کیا نام ہے تیرا؟ اتنے دنوں سے ہم دونوں ساتھ ساتھ مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ مالک سے خرید کر ایک ہی راستے پر کچھ دور تک چلتے بھی ہیں لیکن نام نہیں جانتے۔‘‘ ایک بڑی سی روہو کو دونوں ہاتھوں سے سنبھالتے ہوئے منگرو نے اس کی جانب دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک چمک تھی۔ یکا یک روہو اس کے ہاتھوں سے پھسل کر دوبارہ جال میں جا گری تھی۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پری۔

’’دیکھا، تیرے نام کے چکر میں یہ بھی پھسلی جا رہی ہے سسری۔‘‘ وہ دوبارہ روہو کی طرف لپکا تھا۔

’’نام جان کر کیا کرے گا تو؟‘‘

ایک ہاتھ سے جال کے دونوں سرے پکڑ کے اس نے بھی دوسرا ہاتھ اندر ڈال دیا تھا۔ ایک بڑی سی بھاکر مچھلی چھٹپٹا رہی تھی۔ اسے اٹھا کر اس نے پانی سے بھرے ہوئے بڑے مٹکے میں ڈال دیا۔ زندگی پا کر بھاکر اس میں اُچھلنے لگی۔

’’تیرے ہاتھ سے مچھلی پھسلتی کیوں نہیں؟‘‘

منگرو اس کی طرف دیکھ کر دھیرے سے مسکرایا۔ وہ شرما گئی۔

’’تو ہلکے سے پکڑتا ہوگا۔‘‘ کہتے ہوئے اس کا گیہواں رنگ تانبے کی طرح سرخ ہو گیا۔

’’اچھا، یہ بات ہے؟ تو لے، اس بار کس کے پکڑتا ہوں۔‘‘

اس نے ایک ساتھ آٹھ دس سہنی ہتھیلی میں بھر کر دوسرے مٹکے میں ڈال دیا اور فتحمندانہ

انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ اس کی ننگی پیٹھ اور چھاتی پر مٹ میلی پسینے کی بوندیں سورج کی روشنی میں چمک اُٹھی تھیں۔

"نام نہیں بتایا تو نے؟" اس نے پھر یاد دلایا۔

"چپُنی۔" اپنا نام بتاتے وقت وہ شرما گئی تھی۔ نام سن کر وہ ٹھٹھا لگا کر ہنس پڑا تھا۔

"یہ بھی کوئی نام ہے .....؟ اس سے اچھا تھا کہ سدھری رکھ لیتی ..... چھوٹی سی، سیدھی سادی، پانی سے باہر نکلتے ہی بس ..... ٹیں ....."

وہ لگاتار ہنستا جا رہا تھا۔ چپنی اسے ایک ٹک دیکھے جا رہی تھی۔ سانولا سا گٹھیلا بدن، بانہوں کی مچھلیاں کچھ زیادہ ہی اُبھری ہوئی، بڑھے ہوئے بے ترتیب بال پسینے سے ماتھے پر چپک گئے تھے۔ کمر سے نیچے تک پانی میں ڈوبی ہوئی اس کی بھاری جانگھوں کے کالے گھنے بال چپنی کی رگوں میں ایک چنگاری سی بھر رہے تھے۔ اس نے اپنی آنکھوں کو زبردستی ہٹایا اور جال میں کلبلاتی ہوئی مچھلیوں کی طرف دیکھنے لگی۔ ندی کا پانی چمک رہا تھا اور جال میں پڑی ہوئی بے شمار چھوٹی چھوٹی سِدھریاں بھی کود کود کر چمک رہی تھیں۔

"کیوں، تیرا نام سدھری ٹھیک رہے گا نا؟" وہ اب بھی ہنس رہا تھا۔

"اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے؟ میری بڑھوار زیادہ نہیں ہوئی اسی لیے سب لوگ مجھے چپنی چپنی ہی کہنے لگے۔ اصلی نام تو مائی نے سیتا رکھا تھا لیکن ....."

"نہ سیتا، نہ چپنی، اب سے سِدھری ....." بڑے والے پہینا کو دونوں ہاتھوں سے اُٹھاتے ہوئے اس نے مسکرا کر کہا۔

"سِدھری کیوں؟ ..... سہنی کیوں نہیں .....؟"

چپنی نے ایک بڑے مانُگر کو احتیاط سے اُٹھانے کے لیے جال میں ہاتھ ڈالا تھا اور تبھی اسی مانگر کو پکڑنے کے لیے وہ بھی تیزی سے لپکا تھا۔ مانگر پھسل کر دور ہٹ گیا تھا اور چپنی کے ہاتھ اس کے ہاتھ میں جکڑ گئے تھے۔ چپنی نے جھٹک کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور جھینپ مٹانے کے لیے بولی —— "مانگر بہت تیز ڈنک مارتا ہے۔"

''لیکن سہنی بھی کم نہیں۔'' وہ شرارت سے بولا۔

''تمھارا نام منگرؤ نہیں مانگر ہونا چاہیے۔'' وہ بھی ہنس پڑی —— ایک شرمیلی سی ہنسی۔

دونوں مٹکوں میں مچھلیاں بھری جا چکی تھیں۔ چھپنی نے مٹکا اپنے سر پر رکھوانے کے لیے منگرو کی طرف دیکھا۔ وہ قریب آ گیا تھا۔ اس نے جھک کر مٹکے کو اُٹھایا اور چھپنی کے سر پر رکھ دیا۔ اسی دوران سر سے پاؤں تک اسے نگاہوں سے پرکھ لیا۔ معمول سے کم قد، گٹھیلا بدن، گیہواں رنگ، بڑی بڑی آنکھیں اور ہونٹوں کے اوپر ننھا سا کالا مستا۔ ماتھے تک ساڑی کا آنچل ہونے کی وجہ سے مانگ دِکھائی نہیں دے رہی تھی۔

''تیری شادی ہوگئی ہے؟''

دوسرا مٹکا اپنے سر پر رکھ کے تالاب کے ٹھیکیدار کے یہاں جاتے ہوئے منگرو نے آج پہلی بار اس سے پوچھا۔ اتنے دنوں سے وہ چاہ کر بھی اس سے بات کرنے کی ہمت جٹا نہیں پا رہا تھا۔ آج چھپنی کی ہلکی سی ٹھٹھولی نے اس کے جھجک کے دروازے کو کھول دیا تھا۔

''ہاں۔'' چھپنی نے بڑی بے رخی سے جواب دیا۔ منگرو کے دل میں کچھ بجھ سا گیا۔ بات آگے بڑھائی —— ''کہاں رہتا ہے تیرا آدمی؟''

''دوسری عورت کے ساتھ۔'' اس کی آواز میں نفرت تھی لیکن منگرو کو ایک طرح کی خوشی کا احساس ہوا۔ ''اور تو کہاں رہتی ہے؟''

''بسین پُروا میں، مائی کے ساتھ۔ ..... اور تو کہاں کا ہے؟'' چھپنی نے ایک ہاتھ سے مٹکا سنبھالے، دوسرے ہاتھ سے سر پر رکھی ہوئی بِڑئی ٹھیک کرتے ہوئے پوچھا۔

''میں کرچھیاؤں کا ..... ملاح ٹولے میں رہتا ہوں ..... ماں باپ لڑکیاں میں ہی مر گئے۔ کگا نے پالا۔ کاکی تو بس .....''

''اور تیرا بیاہ .....؟''

''نہ گھر نہ دُوار، نہ مائی نہ باپ ...... کون دے گا اپنی بٹیا۔ مچھلی بیچ کر جو کمائی ہوتی ہے کاکی کے ہاتھ پر دھر دیتا ہوں۔ تیل، نؤن کا خرچا۔''

''تو تو ملاح ہے؟''

''ہاں۔ کیا تو ملاحن نہیں ہے؟''

''نہیں۔ میں بُھر ہوں، بھر۔ تجھ سے اونچی ذات۔'' چھپنی نے ذرا فخر سے کہا۔

''پھر مچھلیاں کیوں بیچتی ہے؟''

''دھندا اب کسی ذات کے نام پر رہ گیا ہے کیا؟ چار پَرانی کا پیٹ پالنا ہے، جسِ طرح بھی بھولے بابا... بیڑا پار لگا دیں۔'' اس نے کنکھیوں سے منگرو کی طرف دیکھا۔ منگرو بھی مسکرا اُٹھا۔

''ایک طرف تو تو مجھ سے اونچی ذات کی بنتی ہے، دوسری طرف دھندے کے نام پر ذات برادری نہیں مانتی۔ یہ کیا بات ہوئی؟''

''دیکھ، ذات کے نام پر آپس میں ہم چاہے لڑیں چاہے مریں لیکن ایک جگہ تو سب ایک ہی ہیں۔ دھرم کے نام پر ہم سب ہندو ہیں تو ذات کے نام پر الگ الگ رہنے سے کیا ہوتا ہے؟ رہیں گے تو ہندو ہی نا؟''

چھپنی اپنی دلیل سے منگرو کو ہرا دینا چاہتی تھی لیکن منگرو کسی موقع کی تلاش میں تھا۔

''لیکن اونچی ذات والے ہمیں کہاں ایک سمجھتے ہیں۔ اپنے ساتھ بٹھا کر پوجا پاٹ، کھانا پینا کہاں کرتے ہیں؟''

''ہوں! کب کی بات تو کر رہا ہے؟ پرانا زمانہ جسے ہم نے دیکھا نہیں، اس وقت کی سنی سنائی بات کر رہا ہے تو۔ بھگّو بابا کے یہاں ہر سال کڑھائی چڑھانے ڈوم، دھرکار، چمار، اہیر، ٹھاکُر، بابھن سب تو آتے ہیں۔ برگد کی چھاؤں میں سب ایک لائن سے چولھا جلاتے ہیں، حلوہ پوری بناتے ہیں، بھگّو بابا کو چڑھاتے ہیں، پجاری جی سے ہوم کرواتے ہیں۔ کون منع کرتا ہے؟ یا کون ذات پوچھتا ہے؟ بنرجی بابو کے یہاں جب بھی مچھلی پہنچانے جاتی ہوں، ان کی پتنی بنا چائے پلائے آنے نہیں دیتی۔ وہ بھی اپنے گلاس میں۔ یہ سب بھڑکانے والی بات ہے۔ یہ نیتا لوگ لوٹنے کھانے کے لیے ہم لوگوں کو بھڑکاتے ہیں۔ ہم سمجھتے نہیں اور یہ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ ہمارے اوپر اتیاچار اپنے ہی آدمیوں سے کروائیں گے اور تہمت دھر دیں گے کہ اونچی ذات والے سب

کررہے ہیں۔ ارے، ہم سب سمجھتے ہیں۔ آگ لگا کر بجھانے کی بات کرتے ہیں۔ سب چال ہے چال، ان لٹیروں کی۔''

چھپنی اپنی دھن میں بولے جارہی تھی اور منگرو دھیان سے سن رہا تھا۔ چھپنی کی باتیں اس کے گلے سے نیچے نہیں اُتر رہی تھیں لیکن اس کے جسم کی خوشبو منگرو کی رگوں میں گھلتی جارہی تھی۔ مٹکے سے چھلکے ہوئے پانی اور تیز برساتی دھوپ کی اُمس کی وجہ سے پسینے سے بھیگ کر چھپنی کا لال بلاؤز شفاف ہوگیا تھا۔ وہ ہوش کھوتا جارہا تھا۔ اس نے بہکتے ہوئے پوچھا—— ''تو تو ذات پات نہیں مانتی؟''

''نہیں، مانتی تو ہوں۔ ذات پات بزرگوں نے بنایا ہے تو کچھ سوچ کر ہی بنایا ہوگا۔''

''کیا سوچ کر بنایا ہوگا؟ کہ ہم نیچ ہیں تو چھوٹا کام کریں۔ ان کی خدمت کریں۔''

''کس کی خدمت، کون کررہا ہے؟ کیا ٹھاکر، باہمن مٹھائی، جوتا چپل، پان سگریٹ کی دکان نہیں چلا رہا ہے؟ ...... یہ سب خالی ہم ہی لوگ سوچتے ہیں، وہ لوگ نہیں۔ چھپنی دنیا دیکھ رہی ہے، دنیا۔ وہ کچھ نہیں بولتے، بس ہم ہی شور مچاتے ہیں۔ صرف شور مچانے سے کچھ نہیں ہوگا۔ پڑھ لکھ کر نوکری کرونا۔ کون منع کررہا ہے؟''

منگرو لاجواب سا ہوگیا۔ اس نے دوسرا پانسہ پھینکا۔

''تو ذات پات کی اتنی وکالت کررہی ہے تو کیا میرے ساتھ سگائی بیٹھ سکتی ہے؟ میں تیرا ہاتھ تھامنے کو تیار ہوں۔''

چھپنی یکایک کھڑی ہوگئی۔ ایک پل کے لیے اس نے دھیان سے منگرو کو دیکھا اور شرماتے ہوئے بولی، ''تجھ سے سگائی کرنے میں باپو کو برادری میں ڈنڈ بھرنا ہوگا۔ پھر بھی مائی سے پوچھ کر بتاؤں گی۔''

''اماں ..... وہ سادھو ...... پکڑ .... نہیں جاؤں گی .....'' ننھکی نیند میں بڑبڑا رہی تھی۔ چھپنی بغیر چونکے ماضی سے نکل کر حال میں آ گئی۔ ایک سہانا سپنا بیچ میں ٹوٹ گیا لیکن اسے وہ جب چاہے جوڑ سکتی ہے۔ اس نے ننھکی کو دھیرے سے ہلایا تاکہ اس کا بھیانک خواب بھی ٹوٹ

حقیقت نگاری سے جوڑنے کا سہرا یشپال اور اپندر ناتھ اشک کے سر ہے۔ یشپال کی بیشتر کہانیاں متوسط طبقے کی زندگی اور مسائل کی عکاسی کرتی ہیں مثلاً 'پتی ورتا'، 'گیان دان'، 'پردہ' وغیرہ۔ ان کی کہانی 'مکریل' اپنے شاعرانہ اسلوب کی وجہ سے یادگار کہانی بن گئی ہے۔ یشپال نے مارکسی نظریات اور اپنی انقلابی زندگی کے تجربات کی بنیاد پر کہانیاں لکھنے کے ساتھ ساتھ جنسی تعلقات کی تصویر کشی کرنے کی جسارت بھی کی ہے۔

ترقی پسند افسانے کا دوسرا اہم نام اپندر ناتھ اشک ہے۔ انھوں نے عموماً متوسط طبقے کی زندگی کے حقائق، حالات اور انسانی زندگی کے تعلقات کو موضوع بنایا ہے۔ علاوہ ازیں سرمایہ داروں کی سرمایہ پرستی اور غریبوں کے استحصال کو بھی اُجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اپنی بعض کہانیوں میں نفسیاتی تجزیے سے بھی کام لیا ہے، مثلاً ڈاچی، کاکڑاں کا تیلی وغیرہ۔ اس طرح اشک کی کہانیوں میں مارکسی اور نفسیاتی دونوں اسلوب کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

ترقی پسندی کی روایت کو آگے بڑھانے والوں میں ناگارجن، امرت رائے، بھیرو پرساد گپت اور رانگے راگھو کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ آزادی کے بعد فرقہ پرستی میں اضافہ ہوا تو فرقہ پرستی کے مختلف روپ اور زاویوں پر مسلسل کئی عمدہ کہانیاں لکھی گئیں جیسے پارٹیشن (سوئم پرکاش)، پاکستانی ایجنٹ (جے نندن) وغیرہ۔ بدعنوان سیاستدانوں اور غیر منصفانہ سماجی حالات کے خلاف نکسلی تحریک نے زور پکڑا تو سنجیو نے 'اپرادھ'، 'لٹریچر' میں اس کی عکاسی کی۔ سماجی و سیاسی بدعنوانیوں کے خلاف کئی زبردست کہانیاں لکھی گئیں، مثلاً وِدائی کانڈ (چندر کشور جائسوال)، شہر کوتوال کی کویتا (دیویندر)، بوتھ نمبر ٦٦٠ (دھنیش دت پانڈے)، ہوا باز (گووِند مشر)، جگدمبا بابو گاؤں آرہے ہیں (چترا مدگل) وغیرہ۔ سرمایہ دارانہ سیاست کی عکاسی کرنے والی عمدہ کہانیوں میں شطرنج کے کھلاڑی (میتریئی پشپا)، رس بے رس (جے نندن)، کرانتی کی تلاش (دیویندر) شامل ہیں۔

اس دور میں چند ایسے کہانی کار بھی گزرے ہیں جنھیں کسی مخصوص مکتب سے وابستہ نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً بے چین شرما 'اُگر' جن کی کہانیوں میں مسلّمات کے خلاف علم بغاوت بلند کیا گیا

جائے۔ ننھکی کروٹ بدل کر سوگئی۔ چھپنی نے اُٹھ کر دھیرے سے کنڈی کھولی اور تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔ چاند بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے کی کوشش کررہا تھا۔ اس کی روشنی میں پیڑ پودوں کی دھندلی شکلیں عجیب وغریب دِکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے دروازہ بند کرلیا اور آکر لیٹ گئی۔ گاؤں میں دو چار آوارہ کتے بھونک رہے تھے۔ بغل کے جنگل سے سیار کے بولنے کی آواز کواڑ کی درازوں سے چھن کر اندر آرہی تھی۔ اس کا گھر گاؤں سے تھوڑا باہر پڑتا تھا۔ اس لیے اس طرح کی آوازوں سے وہ مانوس ہوگئی تھی۔ گرام سماج کی یہ زمین منگرو سے اس کی سگائی کے بعد پردھان نے اس کے نام پٹّہ کردی تھی اور اسی پر مٹّی کی ایک کوٹھری بنا کر دونوں رہنے لگے تھے۔ چھپنی کو یاد آنے لگا۔ کتنی تو تو میں میں کے بعد برادری والوں کو ڈنڈ بھرتے ہوئے بھوج بھات دیا گیا تھا اور چھپنی منگروٗ کے ساتھ بیٹھ گئی تھی۔ گاؤں کی عورتوں کے لیے کچھ دنوں تک وہ گفتگو کا موضوع بنی رہی۔ چھپنی سب لوگوں کو ایک ہی جملے میں خاموش کردیتی تھی —— ''ہم نے اپنا دھرم تو نہیں چھوڑا۔ وہ ہندو، ہم بھی ہندو۔ کوئی تُرک سے سگائی نہیں کیا نا؟''

سب لوگ اس کے جواب سے تلملا اُٹھتے اور اسی اکڑ کے ساتھ منگروٗ کے ساتھ مچھلیاں بیچنے نکل جاتی۔ لیکن اس کی اکڑ کو ایک برس کے اندر ہی گہن لگ گیا۔ ننھکی پیٹ میں ہونے کی وجہ سے اس نے کچھ دنوں کے لیے بھاری مٹکے لے کر بازار جانا بند کردیا تھا۔ منگروٗ کو اکیلے ہی جانا پڑ رہا تھا۔ ایک دن لوٹا تو چھپنی سے بتانے لگا——

''آج لوٹتے وقت میرے گاؤں کے بغل کا رام بہاری ملا تھا۔''

''کیا کہہ رہا تھا؟ تمھارے کگّا کاکی تو مزے میں ہیں نا؟''

چھپنی نے ایک لوٹا پانی اور گڑ کی ایک بھیلی منگروٗ کے سامنے رکھتے ہوئے پوچھا۔

''ارے کہاں .... وہ اب گاؤں میں بہت کم رہتا ہے۔ کبھی کبھی آتا ہے .... بڑے ٹھاٹ ہوگئے ہیں اس کے ..... غریب دکھیوں کی سیوا .... جنتا کی سیوا ...... لوگوں کے بیچ میں پربھوٗ کا سندیش پہنچانا ..... بدلے میں جہاں چاہو گھومو پھرو، کھاؤ پیو ..... سارا خرچا بیٹھے بٹھائے ملتا رہتا ہے .... کام کے لیے در در ٹھوکر کھانے سے چھٹی .... مان سمّان الگ سے .....''

منہ پر پانی کا چھینٹا مارتے ہوئے منگرؤ رک رک کر بتا رہا تھا۔ چھپنی اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

”.....اب تو اس کا نام بھی بدل گیا ہے .... شاید کوئی رابٹ وابٹ ہوگیا ہے .... پہلے تو میں پہچان ہی نہیں پایا۔ مونچھ منڈا ..... پیروں تک لمبا سا کرتے جیسا کپڑا پہنے ہوئے۔“

منگرؤ منہ میں گڑ رکھے ہوئے ہنس رہا تھا۔ چھپنی بھی رام بہاری کی بدلی ہوئی شکل وصورت کا تصور کر کے ہنس رہی تھی۔

”ای چولا بدلنے سے اصلیت بدل جائے گی؟“

”کیا فالتو بول رہی ہے۔ اصلیت لے کر کیا اوڑھے گا بچھائے گا؟ کم سے کم اس پاکھنڈی دھرم کرم کے چکر میں تو پھنسا ہوا نہیں ہے۔ ذات پات، اونچ نیچ کی کوئی بات نہیں ہے۔ جیسے اس دھرم کے اور لوگ ویسے ہی وہ بھی۔

”کیا بہاری نے دھرم بدل لیا ہے؟“ چھپنی نے حیرت اور تجسّس سے پوچھا۔

”ہاں، کیا کرتا؟ اب ٹھاٹھ سے رہتا ہے۔ دھرم کا اُپدیش دیتا ہے۔ سیوا کی باتیں کرتا ہے۔ اس دھرم میں پشت در پشت مرکھپ جاتا تب بھی کیا وہ ان پنڈتوں کی جگہ لے پاتا؟“

”ارے تو اس کا کیا مطلب، کیا دوسرے کا سیندور دیکھ کر اپنا ماتھا پھوڑ لے آدمی۔ سب کی اپنی اپنی اچھائی برائی ہے۔ اور کیا یہاں کی ماٹی کو کرستان یا تُرکستان بنانا ہے؟ ارے ہم لوگ تو کسی کو کہنے نہیں جاتے کہ آؤ ہندو بن جاؤ۔ کس موئے نے اسے دھرم بدلنے کا لوبھ دیا؟“ چھپنی کا غصہ یکایک بڑھ گیا۔

”چپ رہ۔ بنا وجہ کے بڑبڑ کرنے لگتی ہے۔ کیوں کوئی بہکائے گا، پھسلائے گا؟ کوئی اتنا ناسمجھ ہے کیا؟“ منگرؤ کو چھپنی کی بکواس ناگوار محسوس ہو رہی تھی لیکن اس کی بڑبڑ جاری تھی۔

”جب ہم ہی سڑک پر ننگے ناچنے لگیں گے تو کوئی نہ کوئی پیسہ پھینکے گا ہی۔ ہماری غریبی کا، ہماری سدھائی کا فائدہ اُٹھا رہے ہیں سب اور تم طرفداری بتیا رہے ہو؟ ارے غریب دُکھیاروں کے اتنے ہی بڑے سیوک ہیں تو کریں سیوا بنا غرض کے ..... کہ دھرم بدل کر ہی سیوا ہوگی؟“

”تو پاگل ہے۔ سمجھتی نہیں ..... بھگوان نے ایک زندگی دی ہے، اس کو کسی بھی طرح اچھے سے بتا لینا چاہیے۔ نہیں تو مچھلی بیچتے، نون تیل کے چکر میں ہی پوری زندگی بیت جائے گی کولھؤ کے بیل کی طرح۔“ منگرؤ سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ چھپنی خاموشی سے اس کی باتیں سننے لگی۔

”..... بہاری کہہ رہا تھا کہ تم لوگ بھی اسی دھرم کو اپنا لو۔ پربھؤ کی شرن میں چلے آؤ، پھر ساری جھنجھٹ سے دور ہو جاؤ گے۔“

”تم بتا رہے تھے کہ بہاری کا نام وام بدل گیا ہے؟“ چھپنی نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔

”ہاں ..... کچھ .....“

”تو پھر بار بار بہاری بہاری کیوں کہہ رہے ہو؟“ چھپنی نے اسی اطمینان سے کہا۔

”ارے، شروع سے بہریا بہریا بلاتے آئے ہیں تو عادت وہی رہے گی نا؟“ منگرؤ اس غیر ضروری استدلال سے جھنجھلا گیا۔ وہ جلد سے جلد اپنی بات منوا لینا چاہتا تھا۔

”تو کیا سوچتے ہو کہ اپنے دیوی دیوتا کی جو پوجا ہم لوگ پرکھوں کے زمانے سے کرتے آ رہے ہیں وہ عادت بھی تمھارے دھرم بدل لینے سے ختم ہو جائے گی؟ کیا تھوک سکے گا تو بھولے بابا کے مندر میں؟ ..... پیشاب کر پائے گا بھگو بابا کے تھان پر؟ ..... پاؤں رکھ سکے گا رامائن پر؟ ..... نہیں نا؟ ..... تو دھرم بدلنے سے کیا ہوگا؟ ارے ہندوؤں کے کس دیوی دیوتا نے کہا ہے کہ غریبوں کو ستاؤ، دُکھیوں کی مدد مت کرو۔ کرو نا تم یہاں بھی لوگوں کی سیوا ..... سیوا کا ٹھیکہ کیا دوسرے ہی دھرم والوں نے لے رکھا ہے؟“

”بس، بس، بھاشن مت پلا۔ چل کھانا نکال۔“

اور اسی رات منگرؤ گھر چھوڑ کر اکیلے ہی چلا گیا۔ چھپنی تڑپ تڑپ کر رہ گئی۔ ننھکی پیدا ہوئی تو تھوڑا دھیان بٹ گیا۔ بھگو بابا سے منگرؤ کے لوٹ آنے پر کڑھائی چڑھانے کی منّت مان کر روز ہی وہ اس کا انتظار کرنے لگی۔ آج جب کالی چرن ککّا کی بڑی بہو نے اس سے پرو چن سننے کے لیے ساتھ چلنے کی ضد کی تو وہ تیار ہو گئی۔ کھونٹی پر ٹنگی ہوئی گلابی چنری اُتار کر پہنی اور مانگ میں

چوڑا سا سیندور بھر کر اسی کا گول ٹیکا ماتھے پر سجا لیا۔ ہو نہ ہو، بھگو بابا نے اس کا ذہن پھیر دیا ہو۔ اُپدیش دینے کے ہی بہانے وہ اپنے بال بچوں کو دیکھنے آ گیا ہو۔ بھولنا اتنا آسان ہے کیا؟ ننھکی کی انگلی تھامے، من میں ایک آس لیے وہ راستے بھر سوچتی رہی تھی —— اگر سچ مچ وہ منگرؤ ہی ہوا تو .... ننھکی کو تو وہ پہچان ہی نہیں پائے گا۔ تب پیدا ہی کہاں ہوئی تھی۔ لیکن مجھے کیسے نہیں پہچانے گا ..... میرے ہونٹ پر جو کالا مسّا ہے اس کو کتنا پسند ہے ....

وہ اپنے آپ سے ہی شرما گئی۔ سر سے لٹکتی ہوئی ساڑی کا ایک سِرا اس نے کھینچ کر دانتوں میں دبا لیا۔ تین چار مہینے پہلے جب مچھلی دینے بنرجی بابو کے گھر گئی تھی تو انھوں نے ایک شک بھری بات بتائی تھی ——

’’چھپنی، تمھارے پتی کے بارے میں کچھ پتا چلا؟‘‘

’’نہیں بابو جی۔ گھوم لینے دو دیس دنیا۔ پھر تو لوٹ کر آئے گا ہی۔ جائے گا کہاں؟‘‘ چھپنی نے مٹکے میں سے مچھلیاں نکالتے ہوئے کہا تھا۔

’’ارے بھائی، پتہ چلاؤ۔ آج کل بہت پالیٹکس ہے۔‘‘

بنرجی بابو نے مچھلی تُلواتے ہوئے اس سے ہمدردی جتائی۔ چھپنی نے انھیں ایک دن بتایا تھا کہ کس طرح اس کا پتی گھر چھوڑنے سے ایک دن پہلے دھرم بدلنے کی بات کر رہا تھا۔

’’ابھی پیپر میں نکلا ہے کہ تین چار پادری زندہ جلا دیے گئے۔ لاش بھی پہچاننے کے لائق نہیں رہی۔‘‘ بنرجی بابو بتا رہے تھے۔ چھپنی کے ہاتھ ترازو کی ڈنڈی پر کانپ گئے تھے۔

’’اس میں جو پادری مارگریٹ تھا وہ تو یقینی طور پر ہندو تھا۔ اس کے ہاتھ پر منگرؤ لکھا تھا۔ ایسا ہی گودنا جیسا چھپنی کے ہاتھوں پر ....‘‘

ترازو کی ڈنڈی پکڑے ہوئے چھپنی کے ہاتھ کی طرف دیکھتے ہوئے بنرجی بابو کی پتنی کچھ بولتے بولتے یکا یک رک گئی تھی۔ چھپنی بے چین ہو اُٹھی تھی۔ اس نے گھبراہٹ میں اپنے ہاتھ پر گدوایا ہوا گودنا بنرجی بابو کو دِکھاتے ہوئے پوچھا ——

’’کیا اس کے ہاتھ پر بھی ایسا ہی نام چھپا تھا بابو جی؟‘‘

تین سال پہلے ہی دونوں نے میلے میں جا کر گودنا گدوایا تھا۔

''ارے نہیں بھائی۔ بھارت میں تو جانے کتنے منگرو ہیں۔ وہ مارگریٹ تھا، مارگریٹ۔ یہ سب ہمارے لیڈر لوگوں کا چال ہے۔ جلائے گا، مارے گا، پھر ہلّا مچا کر ووٹ بٹورے گا۔ کیا ہو گیا دیش کو۔ بھیشن سنگرام۔ دُکھ ہی دُکھ۔''

بنرجی بابو مچھلی لے کر اندر چلے گئے تھے۔ ان کی بیوی نے چھپنی کو پیسے دے کر ہمدردی سے دیکھا۔

گھر لوٹتے وقت چھپنی کو اپنے پاؤں من من بھر کے لگ رہے تھے۔ طرح طرح کے شکوک دل میں آ رہے تھے۔ کہیں مارگریٹ منگرو ہی تو نہیں؟ ..... نہیں ..... نہیں۔ وہ اتنا دور کیسے جائے گا؟ لیکن پاس بھی تو نہیں ہے۔ اس کا پتہ ٹھکانہ کہاں ہے۔ جانے کے بعد سے کوئی کھوج خبر بھی تو اس نے نہیں لی ..... نہیں، بھگو بابا اس کی مانگ کا سیندور .....نہیں، وہ کیوں غلط سوچے .... وہ جہاں بھی رہے، کُشل سے رہے ......کبھی نہ کبھی تو لوٹے گا ہی۔

اسی امید کے سہارے وہ آج تک جی رہی ہے۔ ہو سکتا ہے اس پادری کے بھیس میں ننھکی کا بابو ہی ہو۔ سوچتے سوچتے اس کے پاؤں سبھی کے ساتھ بڑھ رہے تھے۔ پرارتھنا سبھا میں پہنچ کر وہ مایوس ہو گئی۔ وہ منگرو نہیں تھا۔ پروَچن جاری تھا ——

''ہم سب پربھو کی سنتانیں ہیں۔ کوئی اونچ نیچ نہیں ..... پربھو کی شرن میں آؤ ..... سارے کشٹ دور ہوں گے ......''

چھپنی تنتناتے ہوئے کھڑی ہو گئی ——

''کرو میرے دُکھ دور ..... میرے ننھکی کے بابو کو لوٹاؤ .... کیوں ڈستے ہو ہمارے لوگوں کو ..... ڈھونگی کہیں کے .... جب بنا دھرم بدلے ہوئے تمھارا پربھو مہربانی نہیں کرتا تو وہ کیسا پربھو؟''

مجمع نے چھپنی کا ہاتھ پکڑ کر سبھا سے باہر کر دیا۔

''اماں، سادھو ..... پکڑ رہا ہے .....'' ننھکی دوبارہ نیند میں بڑبڑائی۔ چھپنی کی نیند ٹوٹ

گئی۔ اس نے ننھکی کو سینے سے چپکا لیا اور بدبدائی ——

"نہیں پکڑنے دوں گی۔ کسی کو نہیں پکڑنے دوں گی۔ آنے دے تیرے بابو کو، بس ایک بار وہ آ جائے، پھر دونوں مل کر یہ کام کریں گے۔ موئے دھرم بدلنے چلے ہیں۔ اپنا پھٹا نہیں دیکھتے۔"

باہر صبح کا سانولا اُجالا کواڑ کی دراڑوں سے جھلکنے لگا تھا۔

* * *

فیٹ

گاؤں اور شہر کی حدیں جہاں ملتی تھیں وہاں ایک شاندار میلہ لگا تھا۔ یہ میلہ شیو راتری، دسہرہ یا عید کے موقع پر لگنے والے روایتی میلوں کی طرح نہ تھا۔ کمشنر صاحب کی بیگم کے قائم کردہ ادارے 'پرگتی' کے زیر اہتمام پوری منصوبہ بندی کے ساتھ یہ میلہ لگایا گیا تھا۔ یہ ادارہ خاص طور پر غریبوں، یتیموں، بیواؤں، بے سہارا عورتوں اور بچوں کی فلاح و بہبود کی خاطر قائم کیا گیا تھا۔ اس میلے کو اعلیٰ خاندان کے لوگ 'فیٹ' کہہ رہے تھے مگر عام لوگوں کے لیے یہ میلہ ہی تھا۔

بیسویں اور اکیسویں صدی کے ملاپ نے محبت، رحم اور ہمدردی کی ایک ایسی مصنوعی دھارا کو جنم دیا ہے جو سیدھے افسر طبقے کے گھروں میں جا گھسی ہے اور جس نے افسران کی بیگمات کو شرابور کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ہر ضلع میں ایسی کوئی نہ کوئی رضا کار تنظیم یا سماجی خدمت کا ادارہ وجود میں آ گیا ہے۔ پھر یہ کیونکر ممکن تھا کہ اعلیٰ افسران کی بیگمات کسی کام کی پہل کریں اور چھوٹے افسران کی بیویاں ان کا ساتھ نہ دیں۔ خواہ ان اداروں سے وابستہ ہوکر انھیں کچھ فیض پہنچے یا نہ پہنچے۔ انھیں تو بہرحال اپنے شوہروں کا خیال رکھنا ہی ہے۔

اور آج بھی مسز کمشنر کے ساتھ مسز کلکٹر، مسز سی ڈی او، مسز اے ڈی ایم، مسز ایس پی، مسز ڈسٹرکٹ جج کے ساتھ ساتھ چھوٹے بڑے کئی افسران کی بیویاں اس فیٹ کو کامیاب بنانے اور پچھلے فیٹ کی کامیابی کے بارے میں گفتگو کرنے میں مصروف تھیں۔ ان کے شوہروں کے

اردلی، بندوق بردار اور پولس والے اکتائے اکتائے سے خدمت انجام دے رہے تھے۔

ایک وسیع و عریض قطعۂ اراضی کو چاندنی اور قنات سے گھیر کر میلے کی حد بندی کر دی گئی تھی تا کہ سب لوگ داخلے کے دروازے ہی سے اندر آئیں اور اس طرح داخلہ فیس کے دو روپے کا کوپن فروخت کیا جا سکے۔ اندر بڑے ہی منظّم ڈھنگ سے دکانیں سجائی گئی تھیں۔ میلہ گاہ کے بیچوں بیچ چھوٹی چھوٹی رنگ برنگی چھتریوں کے نیچے گول میز کے چاروں طرف کرسیاں رکھی تھیں جن پر لوگ بیٹھے باتیں کرتے ہوئے کافی یا کولڈرنک کی چسکیاں لے رہے تھے۔ ایک طرف کونے میں میلے کے افتتاح کے لیے خوبصورت شامیانے کے نیچے پھولوں سے سجا ہوا اسٹیج بنایا گیا تھا۔ اس کے اردگرد پڑی ہوئی خالی کرسیوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ افتتاح ہو چکا ہے۔ اسٹیج بھی خالی تھا اور آگے رکھے ہوئے صوفوں پر افسران کی بیویاں آپس میں بات چیت کر رہی تھیں۔ سب سے کنارے والے صوفے پر مسز کمشنر سے ٹی وی والے انٹرویو لے رہے تھے۔

''آپ نے اس فیٹ کا اہتمام کیا ہے۔ یہ بتائیے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟''

مسز کمشنر اپنی ساڑی کا پلّو ٹھیک کرتے ہوئے بڑی تمکنت سے جواب دیتی ہیں، ''اس کا مقصد غریب، یتیم اور بے سہارا عورتوں کی مدد کرنا ہے۔ اس سے جو پیسہ جمع ہوگا اس سے ....''

''آپ کیسے معلوم کرتی ہیں کہ کسے مالی مدد کی ضرورت ہے کیونکہ آجکل تو جھوٹ اور سچ میں فرق کرنا مشکل ہو گیا ہے۔''

''جیسے کسی کا شوہر مر گیا، گھر میں کوئی ارننگ ممبر، آئی مین کمانے والا نہیں ہے یا یتیم بچے ہیں یا اس طرح کا کام کرنے والا کوئی ادارہ ہو تو ہم اس کی مدد کرتے ہیں۔''

ننھی سُبھاگی شامیانے کے لیے گاڑے گئے لوہے کے سفید کھمبے کو پکڑے ہوئے حیرت سے سب دیکھ رہی تھی۔ میڈم کی بات کانوں میں پڑتے ہی اس کے ننھے سے دل میں امید کا ایک چھوٹا سا دِیا جھلملا اُٹھا تھا۔ کیا میڈم جی، ہمارے گھر بھی مدد دیں گی۔ اس کے بھی تو بابو جی نہیں ہیں۔ دو تین سال پہلے ڈیوٹی پر گئے تھے تو آج تک واپس نہیں آئے۔ سڑک کی صفائی کرتے تھے۔ لوگ کہتے ہیں کہ ٹرک سے .....!

''ابھی پچھلے دنوں ہم نے 'بال سُدھار' ادارے کے بچوں کے ساتھ مل کر مکر سنکرانتی کا تہوار منایا۔ انھیں کھچڑی کھلائی گئی، ان کی دیکھ بھال کا جائزہ لیا گیا۔ رِئلی اِٹ واز اے سکسیس فل پروگرام....''

میڈم جی کی بات سے سُہاگی کا دھیان اپنے بابو جی سے ہٹ گیا۔ کتنا اچھا لگتا ہے جب میڈم لوگ ساڑی کا اُلٹا پلّہ لیے ہوئے انگریزی بولتی ہیں۔ ایک اس کی اپنی میڈم جی ہیں جو ہمیشہ اسے پہاڑا بھولنے پر مرغا بنا کر کلاس میں کھڑا کر دیتی ہیں۔ کبھی انگریزی نہیں بولتیں، بس چاؤں چاؤں ....نہیں آتی ہوگی انگریزی تبھی تو ......

سُہاگی حیرت اور پیار سے اس میڈم جی کو دیکھنے لگی تھی۔ نئی قیمتی ساڑی، کندھے تک کٹے بال، ہونٹوں پر گہری لالی، ہاتھوں میں انگوٹھی، گلے میں موٹی سی سونے کی زنجیر، کلائی میں چمکتی گھڑی، اونچی ایڑی کی سینڈل ..... اس طرح کے لوگ ہی سُہاگی کی نظر میں میڈم جی ہوتے ہیں۔ باقی سیدھے پلّو میں میلی کچیلی یا پرانی سی ساڑی، بالوں میں کالے دھاگے کی بنی ہوئی لمبی چوٹی کو گوندھ کر سر پر جوڑا بنائے، ہاتھوں میں کانچ کی گھسی پٹی مٹ میلی، لال پیلی ڈھیروں چوڑیاں، گلے میں اسٹیل یا چاندی کی موٹی زنجیر، کانوں میں اسی طرح کے لٹکتے جھمکے اور پاؤں میں گھسی ہوئی پرانی ہوئی چپل پہنے، ٹوکری میں سبزی ترکاری بیچتی، سوپ چھلنی بناتی، بانس کی ٹوکریاں بنا کر بیچتی یا پھر شیشہ جڑے لکڑی کے صندوق میں سیندور، بندی، گنڈا، جھمکے، بالی، نتھنی، رنگ، لالی سجائے گھر گھر آواز دے کر بیچتی ہوئی عورتیں، اس کی اماں کے علاوہ چاچی، پھوپھی، نانی، دادی، خالہ ہوتی ہیں۔ سُہاگی کو اس طرح تقسیم کرنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی۔ بس، عددوں والی تقسیم کرنے میں اس کا دل نہیں لگتا۔

اس کی اماں بھی رنگ، بندی، لالی، کالا دھاگا اور درگا مائی کا تعویذ ٹوکری میں لیے پرانی ساڑی سے ڈھانکے گاؤں گاؤں جا کر بیچتی ہے۔ کوئی نقد پیسے دے کر خریدتا ہے تو کوئی گیہوں، جوار، دھان سے درگا مائی کا تعویذ خرید کر اپنے بچے کے گلے میں پہناتا ہے تاکہ کسی کی نظر نہ لگے۔ اماں سارا اناج ٹوکری میں ساڑی کے نیچے رکھتی جاتی ہے اور گھر آکر سُہاگی کو اسے الگ

الگ کرنے کے لیے دے کر خود کھانا بنانے بیٹھ جاتی ہے۔ چھوٹا بھائی چھمن اس کے پیچھے پیچھے ریں ریں کرتا رہتا ہے۔ اماں اپنے ساتھ اسے بھی لے جاتی ہے۔ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے امّاں اسے زیادہ چاہتی ہے۔ بڑا بھیّا تو اسکول سے آتے ہی اسے بستہ دے کر ٹھاکر کے بغیچے میں کھیلنے کے لیے چلا جاتا ہے اور وہ خود کٹیا کے دروازے پر بیٹھ کر اماں اور چھمن کے آنے کا انتظار کرنے لگتی ہے۔ کبھی بھیّا کی چھٹی جماعت کی ہندی کی کتاب نکال کر تصویریں دیکھتی ہے۔ حروف ملا کر پڑھنا تو اسے دوسری جماعت ہی میں آ گیا تھا اور اب تو وہ تیسری جماعت میں پڑھتی ہے۔ لیکن اس کی کتاب میں نہ تو اتنی خوبصورت تصویریں ہیں اور نہ ہی کوئی کہانی۔ بھیّا کی پڑھی ہوئی کتاب اماں نے لئی سے چپکا کر اس کے لیے رکھ چھوڑی تھی۔ اس لیے کتاب کھولنے پر ورق ورق چر چرا کر پھٹ جاتے ہیں۔

"جو بچے تعلیم سے محرومی کی وجہ سے در در ....."

انٹرویو جاری تھا۔

"اونہ! ہر جگہ پڑھائی کی بات ...."

سُہاگی نے منہ پھیر لیا۔ اسے ان باتوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اس کے کام کی باتیں بھی نہیں تھیں۔ اس نے آس پاس نظر دوڑائی۔ چھمن کہاں ہے؟ ابھی تو یہیں اس کے پاس کھڑا تھا۔ بہت حرامی ہو گیا ہے۔ ملے تو ابھی دوؤں دو جھانپڑ۔ ایک تو بھؤتوں جیسا دھول مٹی میں اٹا ہوا، پھٹی ہوئی جانگھیا اور گندی قمیص پہنے، ضد کر کے میلہ دیکھنے آ گیا اور اس پر سے ..... سُہاگی نے جھٹ سے اپنے کپڑے پر نیچے سے اوپر تک سرسری نظر ڈالی۔ اسکول والا سفید شرٹ اور نیلا اسکرٹ، اس نے کل ہی دھو کر سکھا لیا تھا۔ چڈی تو نیچے ہے، کون دیکھتا ہے؟

اپنے کپڑوں کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد اس نے چھمن کو ڈھونڈنے کے لیے دوبارہ میلے میں چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ بھیڑ بہت زیادہ تو نہیں تھی پھر بھی چار پانچ سو بچے، بوڑھے، عورتیں اور پولس والے تو ہوں گے ہی۔ سُہاگی نے ایک سرے سے دیکھنا شروع کیا۔ سجا ہوا گھوڑا، اونٹ، چرخی والا جھولا۔ سُہاگی کی نگاہ چرخی سے لٹکے ہوئے لکڑی کے سفید

ہے۔ ان کی کہانیوں میں سیاسی نظریات، سماجی روایات اور ضعیف الاعتقادی کے سلسلے میں ایک نیا زاویۂ نظر اور غم وغصہ پایا جاتا ہے۔ دوزخ کی آگ، کلاکار، چنگاریاں ان کی کہانیوں کے مجموعے ہیں۔ بھگوتی چرن ورما نے مذہب، اقتدار، سماج، سیاست، تاریخ وغیرہ موضوع پر دل کو چھوٗ لینے والی کہانیاں لکھی ہیں۔ دو بانکے، پرائشچت، سوٗکھی لکڑی وغیرہ ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ وشنو پربھاکر نے اپنی کہانیوں میں خاندانی، سماجی اور سیاسی زندگی کی جدوجہد کو حقیقت نگاری کے اسلوب میں پیش کیا ہے۔ دھرتی جب گھومتی ہے، گرہستی، رحمان کا بیٹا وغیرہ ان کی عمدہ کہانیاں ہیں۔ امرت لال ناگر بنیادی طور پر ناول نگار ہیں لیکن انھوں نے کئی اچھی کہانیاں بھی لکھی ہیں جیسے دو آستھائیں، قیامت کا دن، گورکھ دھندا وغیرہ۔ چندر گپت وِدیا النکار کی کہانیوں میں موضوع اور اسلوب دونوں سطحوں پر نیاپن پایا جاتا ہے۔ ماسٹر صاحب، ک کھ گ، کام کاج وغیرہ ان کی مشہور کہانیاں ہیں۔ اس دور کی خاتون افسانہ نگاروں میں سُبھدرا کماری چوہان، ہیم وتی دیوی، کملا دیوی چودھری مشہور ہیں۔ ان کی کہانیوں میں عورت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کیا گیا ہے۔ ان کی بیشتر کہانیاں شوہر اور ماں کے کردار کے گرد گھومتی ہیں۔

آزادی کے بعد جب سیاسی اور معاشی طاقت چند افراد، طبقوں اور پارٹیوں کے ہاتھوں میں مرتکز ہونے لگی اور عوام آزادی کے فائدوں سے محروم ہونے لگے تو فنکار اُلجھن اور مایوسی کا شکار ہو گئے۔ عوام کے قلبی احساسات، ان کی اُمید و نا اُمیدی، خود اعتمادی و بے اعتمادی، یقین و بے یقینی کے اظہار کو فنکار نے اپنی ذمہ داری سمجھا۔ یہی 'نئی کہانی' کا تھیم ہے۔ نئی کہانی کا فنکار حقائق کی پیچیدگیوں سے واقف ہے، اس لیے وہ اپنے مسلّمات کی بجائے عصری زندگی کے حقائق کو پیش کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا ہے۔ ہیئت کے اعتبار سے نئی کہانی تاثر کو کسی نقطے پر مرکوز کرنے کی بجائے زندگی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے احساس کی کہانی ہے جو اثر کی گہرائی و گیرائی پر زور دیتی ہے۔ نئی کہانی کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔ خاندانی نظام کے ٹوٹنے، بکھرنے اور بزرگوں کے بے مصرف سمجھے جانے کو اوشا پریمبدا نے اپنی کہانی 'واپسی' میں انتہائی مؤثر ڈھنگ سے بیان کیا ہے۔ کملیشور کی 'کمرہ اور گلی'، راجندر یادو کی 'گارجین'

گھوڑوں میں اُلجھ گئی۔ وہ شوق سے آہستہ آہستہ اس طرف بڑھ رہی تھی۔ اسی وقت قریب ہی ہاتھی کے آس پاس کھڑے ہوئے بچوں کی بھیڑ میں چھمن کھڑا دِکھائی دیا۔ سُبھاگی نے جھپٹ کر پیچھے سے چھمن کی قمیص پکڑ کر کھینچ لی اور اس کی پیٹھ پر ایک دھپ لگا دی۔

''ہاتھ چھڑا کر بھاگے جا رہے ہو؟ کوئی بہکا لے جائے تو.....''

''اِنھیں بھی اپنے کِڈنیپ ہونے کا ڈر ہے۔'' پاس ہی کھڑے ہوئے دو نوجوان سُبھاگی کی بات سن کر ہنس پڑے تھے۔ سُبھاگی شرما کر چھمن کو کھینچتے ہوئے چرخی والے جھولے کے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔ ٹی وی کی کیمرہ ٹیم میڈم کو ساتھ لیے ہوئے جھولے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ مسز کمشنر بتا رہی تھیں ——

''یہ ہاتھی، گھوڑے، جھولے اور منکی ڈانس ہم نے خاص طور پر اس لیے رکھا ہے کہ بچے اس سے زیادہ اٹریکٹ ہوں گے اور اس سے ہمیں زیادہ فائدہ ہوگا۔ اس میں لاس کا کوئی ڈر نہیں۔ عورتیں چاٹ وغیرہ زیادہ پسند کرتی ہیں اس لیے ان کا بھی انتظام .....'' کہتے ہوئے مسز کمشنر کا قہقہہ گونجا تھا۔

سُبھاگی نے پلٹ کر دیکھا۔ میڈم جی کی ہنسی کتنی اچھی ہے۔ سامنے والے دونوں دانتوں کے بیچ میں جو تھوڑی سی خالی جگہ ہے وہ بھی بڑی پرکشش لگ رہی ہے۔ اماں کے دونوں دانتوں کے بیچ ایسا ہی کالا سا چھید ہے لیکن اماں ایسے ہنستی کہاں ہے جو خوبصورت لگے۔ جب کبھی ہنستی ہے تو منہ پر ہاتھ رکھ لیتی ہے۔

''میڈم، ایک شاٹ اس جھولے کا بھی لے لیتے ہیں۔ میلے کا ایفکٹ اچھا آئے گا۔''

''ہاں، ہاں لے لیجیے۔''

''کچھ بچوں کو ذرا ان گھوڑوں پر بٹھا کر جھلوا دیجیے۔''

سپاٹ بوائے ہاتھی کے پاس کھڑے ہوئے کچھ بچوں کو پکڑ کر لے آیا تھا۔

''چلو، چلو، تم لوگ گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔''

''شِٹ .....ان پر کون بیٹھے گا؟'' اور بچے ہی ہی کرتے ہوئے بھاگ کر اپنے ماں باپ

کے پاس چلے گئے۔

''یہ افسروں کے بچے ہیں۔ یہ نہیں بیٹھیں گے۔ ان پر گاؤں کے بچے زیادہ انجوائے کریں گے۔ شام کو آئیں تو اچھا شاٹ مل جائے گا۔'' مسز کمشنر کیمرہ مین کو سمجھا رہی تھیں۔

''اب اس کام کے لیے دوبارہ آنا تو ممکن نہیں ہے میڈم۔''

یکایک کیمرہ مین کی نگاہ پاس ہی کھڑی ہوئی سُبھاگی اور چھمن پر پڑی تو اس نے کہا ''اے .....اے .....تم دونوں چلو بیٹھ جاؤ گھوڑے پر۔''

سُبھاگی نے ہچکچاتے ہوئے کہا، ''ہمارے پاس ٹکٹ نہیں ہیں۔''

''کیا اس پر بھی کوپن ہے میڈم؟'' کیمرہ مین نے مسز کمشنر سے پوچھا۔

''ہاں، بہت ہی نامِنل ..... ڈیڑھ ڈیڑھ روپے کا کوپن ہے۔''

''لیکن ان دونوں کے پاس شاید نہیں ہوگا۔ دیکھنے سے ہی لگ رہا ہے ......اِنھیں ایسے ہی بٹھا دیتے ہیں۔ ایک شاٹ تو لینا ہی ہے۔ تھوڑا سا گھوم بھی لیں گے۔''

مسز کمشنر تھوڑا ہچکچائیں۔ سُبھاگی نے پانچ کا نوٹ کس کر مٹھی میں دبا لیا تھا۔ کہیں دیکھ لینے پر وہ اسے ٹکٹ خریدنے کے لیے نہ کہہ دیں۔ لیکن کیمرہ مین کی باتوں سے وہ تھوڑی بے عزّتی بھی محسوس کر رہی تھی۔ وہ اتنی غریب اور بے سہارا تو نہیں تھی کہ اپنے پیسے سے جھولا نہ جھول سکے۔ چلتے وقت اماں سے ضد کر کے اس نے پانچ روپے مانگ لیے تھے۔ اماں سے آج ہی ستارا پھوپھی دس روپے میں اسٹیل کی ایک لڑی اور ناک کی کیل خرید کر لے گئی تھیں۔ اسی میں سے اماں نے کھسیا کر ہی سہی، اسے میلہ دیکھنے کے لیے پانچ روپے دے دیے تھے۔ پھر یہ آدمی اس پر اتنا ترس کیوں کھا رہا تھا؟ کپڑے بھی وہ صاف پہن کر آئی ہے۔ بس، یہی چھمنوا ہی ہر جگہ ناک کٹواتا ہے۔ حرامی کہیں کا۔ سُبھاگی نے دل ہی دل میں چھمن کو گالی دی۔

''چلو، چلو، بیٹھ جاؤ'' کیمرہ مین نے ان دونوں کو دھیرے سے دھکا دیا۔ چھمن کے چہرے پر ہنسی کھل پڑی تھی۔ ناک کے نیچے سفید پپڑی چر چرا اُٹھی تھی۔ لیکن سُبھاگی کے چہرے پر ندامت اور شرمندگی کے جذبات تھے۔ وہ کیسے بغیر ٹکٹ اس جھولے پر بیٹھے؟ تبھی میڈم جی نے اسپاٹ

بوائے کو اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''بٹھا دو ان دونوں کو جھولے پر.... تھوڑا گھما بھی دو جھولا۔''

چھمن کو پکڑ کر اسپاٹ بوائے نے لکڑی کے ایک گھوڑے پر بٹھا دیا۔ گھوڑے کے ہلنے کی وجہ سے سہم کر اس نے لوہے کی سلاخ کو کس کر پکڑ لیا۔ اس کے بعد سُہاگی کو بھی جھؤلے پر بٹھا دیا گیا۔ اس نے ایک ہاتھ سے سلاخ پکڑ کے دوسرے ہاتھ کی مٹھی میں روپے کو دبا لیا۔ میڈم جی کی بات اس کے کانوں میں پڑی، ''ہاؤ لکی دے آر! مفت میں جھؤلا بھی جھؤل رہے ہیں اور ٹی وی پر بھی آ جائیں گے۔''

جھولا گول گول گھوم رہا تھا لیکن سُہاگی کا دل خوفزدہ ہو گیا۔ کہیں میڈم جی کو یہ تو پتہ نہیں چل جائے گا کہ وہ ٹکٹ لیے بغیر اسٹیج کے پیچھے سے قنات اُٹھا کر، چوری سے چھمنوا کے ساتھ گھس آئی ہے؟ کیا کرتی وہ؟ باہر ہی دو، دو روپے کا ٹکٹ لے لیتی تو اندر کیا خریدتی؟ ایک روپے میں کیا ملتا؟ اگر وہ لوگ چھمن کا ٹکٹ نہ لیتے تو وہ اپنا ٹکٹ خرید لیتی۔ لیکن وہ لوگ تو چھمنوا کا ٹکٹ بھی مانگ رہے تھے جبکہ ابھی وہ بہت چھوٹا ہے۔ ریل، بس، ٹیمپو میں تو اماں اسے گود میں لے کر بیٹھ جاتی ہے تو کوئی پوچھتا تک نہیں۔

''چلو اُترو.... ہو گیا....''

جھولے سے اُترتے ہی اس کی جان میں جان آئی۔ وہ چھمن کو گھسیٹتے ہوئے فوراً وہاں سے کھسک گئی۔ کہیں اب اس سے کوئی ٹکٹ کے بارے میں نہ پوچھ بیٹھے۔

''بہت مزہ آیا.... ہے نا؟'' چھمن خوش ہو کر پوچھ رہا تھا۔

''ہاں۔'' سُہاگی اپنے اگلے اقدام کے بارے میں سوچتی ہوئی بولی۔

اسے یہ میلہ عجیب لگ رہا تھا۔ اس نے دسہرہ اور شیوراتری کا میلہ بھی دیکھا تھا لیکن اس میں آنے جانے پر کوئی پابندی نہیں ہوتی۔ اس دن بھیّا کی کتاب میں 'عیدگاہ' کہانی پڑھی تو اس میں بھی کہیں روک ٹوک کی لکھی نہیں تھی۔ بڑی اچھی لگی تھی کہانی۔ کیسے حامد کی دادی اسے میلہ دیکھنے کے لیے تین پیسے دیتی ہے اور کیسے وہ اپنے لیے کچھ نہ خرید کر دادی کے لیے چمٹا خریدتا ہے۔ کتنی غریبی رہی ہوگی بیچارے حامد کے گھر! ہمارے گھر میں تو سارے برتن ہیں بلکہ کبھی کبھی تو بیلا کاکی

اپنے گھر کسی تقریب کے موقع پر اس کے گھر سے تھالا اور کڑاہی مانگ کر لے جاتی ہیں۔ کہتی ہیں کہ ان کے پاس اتنا بڑا برتن نہیں ہے۔ بیچارہ حامد ..... تین پیسے میں کیا ملتا ہے! اس وقت تو چمٹا مل بھی گیا۔ لیکن آج کے زمانے میں تو کچھ بھی نہیں ملتا۔ بیس بیس پیسے کا سکہ تو اب دکاندار نہیں لیتے۔ کہتے ہیں اب نہیں چلتا۔ تو کیا کرتا بے چارہ حامد تین پیسے میں؟

سُہاگی نے مٹھی میں دبے پانچ روپے کے نوٹ کو کھول کر دیکھا۔ گویا حامد کے پیسوں کے مقابلے میں اس کا وزن ناپ رہی ہو۔ ہتھیلی کے پسینے سے بھیگ کر نوٹ چپک گیا تھا۔ اس نے آہستہ سے نوٹ کو دونوں ہاتھوں میں لے کر پھیلایا اور دھیرے دھیرے اس پر منہ سے پھونک مارنے لگی۔

"چلو اِدھر سے میلہ دیکھتے چلیں....." کہتے ہوئے سُہاگی ننھے ننھے ڈگ بھرتی سجی دھجی دکانوں کے سامنے سے دھیرے دھیرے گزرنے لگی۔ ساتھ میں چھمن بھی بہت خوش خوش یہ سب دیکھتا ہوا چل رہا تھا۔ قالین کے اسٹال کے سامنے سُہاگی کے قدم تھم سے گئے۔ رنگ برنگی مخملی قالین کو ہاتھ سے چھوا تو محسوس ہوا جیسے مرغی کے چوزے کو چھو لیا ہو۔ دکان کے سامنے دیوار پر ایک خوبصورت قالین کے ساتھ ہی شیر، زیبرا اور چیتا کی مخملی تصویر ٹنگی ہوئی تھی۔ پاس ہی کھڑی ہوئی ایک عورت نے اس کی قیمت پوچھی تھی۔

"ڈیڑھ ہزار روپے میڈم .... چاہیں تو اسے دیوار پر ٹانگ دیں یا پاپوش بنالیں۔"

"اور وہ قالین ....؟"

"ساڑھے نو ہزار ....."

"باپ رے ..... چادر کے برابر اس چھوٹی سی چیز کی اتنی قیمت ..... اماں جو کئی ساڑیوں کو جوڑ کر اس پر رنگ برنگے موٹے دھاگے سے گھنی سلائی کر کے لحاف بناتی ہیں، وہ بچھانے پر کتنا اچھا لگتا ہے۔ ہوں .... لوٹ رہے ہیں سب۔" سوچتے ہوئے سُہاگی حقارت کی نظروں سے دکاندار کو دیکھتی ہوئی آگے بڑھ گئی۔ نشانے بازی، لکڑی کے کھلونے، بناوٹی پھولوں اور خوبصورت ساڑیوں کی دکانوں کو ایک سرسری نگاہ سے دیکھتی ہوئی سُہاگی کے پیر گول گپّے کی دکان پر تھم گئے۔

''اے ..... کتنے کی ہے آلو کی ٹکیہ؟'' سُبھاگی نے دکاندار سے پوچھا۔

''پانچ روپے پلیٹ۔'' دکاندار نے دوسرے گاہک کو نپٹاتے ہوئے لاپرواہی سے بتایا۔

سبھاگی نے گاہک کی پلیٹ پر کھوج بھری نگاہ ڈالی ..... پتے کی چھوٹی سی پلیٹ میں مشکل سے ایک آلو کی ٹکیہ تھی۔ اتنے میں کتنا وہ کھائے گی اور کتنا لچھمنوا؟ دل ہی دل میں حساب لگاتے ہوئے سبھاگی آگے بڑھ گئی۔

''کھلا دے نا چاٹ۔'' لچھمن مچل اُٹھا۔

''چل، پہلے پورا میلہ گھوم لیں۔ پھر کھلا دوں گی، لوٹتے وقت۔'' سُبھاگی نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''نہیں، میں تو ابھی کھاؤں گا۔'' وہ پھر مچل اُٹھا۔

''وہ دیکھ، وہ بندر کا ناچ .....'' سُبھاگی نے بھائی کو منانے کے لیے دوسری طرف اشارہ کیا۔

''ٹکٹ ..... ایک ایک روپے ..... ٹکٹ ....''

ایک شخص مداری کے آس پاس بندر کا ناچ دیکھنے کے لیے کھڑے ہوئے بچوں اور بڑوں سے پیسے وصول رہا تھا۔ سُبھاگی کو غصہ آ گیا۔ یہ کیا بات ہوئی۔ جہاں دیکھو ٹکٹ! اپنے گاؤں میں تو نہ جانے کتنی بار وہ بغیر ٹکٹ کے بندر کا ناچ دیکھ چکی ہے۔ بس، مداری کے مانگنے پر کبھی کبھار اماں سے مانگ کر دو مٹھی اناج دے آتی تھی۔ یہ سب سوچتے ہوئے سُبھاگی نے بندر کا ناچ دیکھنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

''یہ دیکھ ..... یہ کیا ہے؟'' لچھمن پاس کی دکان میں رکھے ہوئے ڈھیر سارے ہرے ہرے کچے ناریل کو چھوٗ کر سُبھاگی کو بلا رہا تھا۔ کچھ لوگ اسے ہاتھوں میں لیے اس کا پانی اسٹرا سے پی رہے تھے۔

''کیا ہے یہ؟'' سُبھاگی قریب پہنچ کر دکاندار سے پوچھ بیٹھی۔

دکاندار کو شاید اس کے بھولے پن پر پیار آ گیا تھا۔ اس نے سمجھاتے ہوئے کہا، ''یہ ڈاب ہے ڈاب۔ اس میں پانی بھرا ہوتا ہے ..... میٹھا میٹھا۔ اور ناریل کا گودا۔''

’’کتنے کا ہے؟‘‘ سُبھاگی نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

’’دس روپے کا ایک۔‘‘

سُبھاگی کا دل بیٹھ گیا۔

’’آدھا پھوڑ کر دے دو نا۔‘‘ چھمن اپنے لالچ پر قابو نہیں رکھ پا رہا تھا۔

’’نہیں، پھوڑ کر نہیں بکتا۔ یہ کچا ناریل ہے۔ پکا ناریل پھوڑ کر بکتا ہے۔‘‘

دکاندار چھمن کو سمجھا کر دوسرے گاہکوں میں مصروف ہو گیا۔ سُبھاگی مایوس ہو گئی۔ کچھ دیر پہلے کی پانچ روپے کی موٹی رقم اب بیکار لگ رہی تھی۔ اتنے روپے میں کچھ بھی خریدا نہیں جا سکتا۔ سبھاگی کو اپنے آپ پر غصہ آ گیا۔ کچھ تو خریدنا ہی پڑے گا پانچ روپے کا، نہیں تو اماں سے ضد کر کے لینے کا کیا مطلب؟ چھمنوا کو بھی تو کچھ دے کر بہلانا ہے، نہیں تو لوٹتے وقت آفت مچا دے گا۔ وہ جھٹ سامنے والی دوسری دکان پر پہنچی۔

’’کیا ہے یہ؟‘‘

’’چاؤمن....‘‘ دکاندار نے اس کے لباس اور سوال سے اس کی حالت کا اندازہ لگاتے ہوئے بڑی بے رخی سے جواب دیا۔

’’کتنے کا ہے یہ؟‘‘

’’چالیس روپے پلیٹ .... کچھ دیر رکنا پڑے گا۔‘‘ دکاندار نے چاؤمن کے لیے شملہ مرچ کو چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں کاٹتے ہوئے جواب دیا۔ قریب ہی گاجر اور پتہ گوبھی کے پتلے پتلے ٹکڑے نہایت نفاست سے سجا کر رکھے گئے تھے۔ سُبھاگی کے منہ میں پانی بھر آیا تھا۔ ہچکچاتے ہوئے بولی، ’’پانچ روپے کا بنا دو۔‘‘

دکاندار نے نہایت حقارت سے اسے دیکھتے ہوئے پہلے کی تیار کی ہوئی چاؤمن کا بچا ہوا تھوڑا سا حصہ اُٹھا کر ایک پلیٹ میں رکھ کر سُبھاگی کی طرف بڑھا دیا۔ پلیٹ میں چاؤمن کی شکل دیکھتے ہی سُبھاگی کو اُبکائی سی آئی۔

’’چھی، یہ کیچوے جیسا کیا ہے؟‘‘

''چل بھاگ.... جا بھاگ جا.... بڑی آئی چاؤمن کھانے۔''

دکاندار کی ڈانٹ کھا کر سُبھاگی جلدی جلدی آگے بڑھ گئی تھی۔ یکا یک اسے یاد آیا کہ چھمن کب سے ہاتھ چھوڑ کر غائب ہے۔ وہ گھبرا گئی۔ اس بار ملے گا تو اتنا ماروں گی کہ دماغ درست ہوجائے گا۔ جب دیکھو تب ہاتھ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے۔ وہ جھلّائی سی پورے میلے میں اسے ڈھونڈ آئی تھی لیکن وہ نہیں ملا۔ مایوس ہوکر اس نے سوچ لیا کہ شاید وہ گھر چلا گیا ہو۔ کچھ ہی دوری پر تو اس کا گھر ہے۔ میلے پر آخری نظر ڈال کر وہ مایوس قدموں سے داخلہ دروازے سے باہر نکل آئی۔ اس نے نکلتے ہی دیکھا کہ بائیں طرف چھمن ہاتھ میں ایک کچا ناریل لیے ہوئے قنات سے لگ کر بیٹھا ہے۔ وہ اسے ہلا کر، کانوں کے پاس لا کر کچھ سننے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کہاں سے پایا رے چھمنوا؟'' سُبھاگی اپنا سارا غصہ بھول کر خوشی سے اُچھل پڑی، گویا دل کی مراد پوری ہوگئی ہو۔

''اس میں پانی بھی ہے۔'' چھمن اپنی کامیابی پر تھوڑا تن کر ناریل کو کانوں کے پاس لا کر زور زور سے ہلانے لگا تھا۔

''لا دے، میں دیکھوں۔'' سُبھاگی اس کے پاس ہی بیٹھ گئی۔

''چل، اسے پھوڑ کر اس کا گودا کھائیں۔'' چھمن نے ناریل پر اپنا حق جتاتے ہوئے سبھاگی سے چھین لیا۔

''کہاں پایا رے اسے؟ چرایا تو نہیں نا؟'' سُبھاگی نے دوبارہ پوچھا۔

''نہیں، یہیں پڑا تھا۔ پی کر کوئی پھینک گیا تھا۔ دیکھ نا، اس کے اندر کی یہ نلکی۔''

چھمن نے ناریل کے سرے پر بنے ہوئے سوراخ میں ڈالی ہوئی اسٹرا کو کھینچ کر نکالتے ہوئے فاتحانہ انداز میں سُبھاگی کو دِکھایا۔

''پھوڑوں....؟'' چھمن نے سُبھاگی سے دوبارہ اجازت مانگی۔

''نہیں، یہاں کوئی دیکھ لے گا۔ چل، گھر چل کر پھوڑیں گے۔''

اور دونوں خوشی خوشی تیز قدموں سے گھر کی طرف چل پڑے۔

ڈاکٹر غلام نبی مومن اُردو داں حلقے میں ایک ماہر زباندان کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ ایک عرصے تک ٹیکسٹ بک بیورو، پونہ میں اُردو آفیسر کی حیثیت سے اُنھوں نے نصابی کتابوں کی ترتیب و تدوین میں قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ تعلیم و تدریس کے علاوہ اُردو ادب سے بھی اُنھیں خاص شغف ہے۔ تنقید پر اُن کی مرتب کردہ کتاب ’اُردو میں نفسیاتی تنقید‘ تحقیقی و تنقیدی دستاویز کا درجہ رکھتی ہے۔ علاوہ ازیں مراٹھی اور ہندی سے کئی تعلیمی مضامین اور ادبی شہ پاروں کو بھی اُنھوں نے اُردو کا لباس عطا کیا ہے۔ حال ہی میں ہندی کہانیوں کا ایک انتخاب وہ اُردو میں منتقل کر چکے ہیں۔ ’گہری جڑیں‘ ہندی کی معروف ادیبہ ڈاکٹر نیرجا مادھو کی کہانیوں کا انتخاب ہے۔

ڈاکٹر نیرجا مادھو نے ادب کی مختلف اصناف میں طبع آزمائی کی ہے اور ہر صنف میں اپنے قلم کا جادو جگایا ہے۔ ہندی ادب میں بطور کہانی کار اُن کی حیثیت مسلّم ہے۔ یوں تو اُن کی تمام کہانیاں انسانی دردمندی سے سرشار نظر آتی ہیں تاہم اُن بدنصیب لوگوں کے لیے اُن کا قلم خون کے آنسو روتا ہے جو خطِ افلاس سے نیچے ایک اندوہناک زندگی جینے پر مجبور ہیں۔ اس کے علاوہ ہندوستانی عورت کی مظلومیت اور محکومیت بھی اُن کے افسانوں نیز ناولوں کا خاص موضوع ہے۔ بعض افسانوں میں اُنھوں نے معاشرتی زوال اور انسانی رشتوں میں گھلتی خودغرضی کو بھی نشانہ بنایا ہے اور بڑے تیکھے انداز میں اُن پر نشتر زنی کی ہے۔ مقصدیت اور سماجی سروکاروں سے بھرپور اُن کی کہانیوں کو ڈاکٹر غلام نبی مومن نے اُردو میں منتقل کر کے ایک قابل تحسین خدمت انجام دی ہے۔ ڈاکٹر غلام نبی مومن چونکہ اُردو اور ہندی دونوں زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں اس لیے اُن کے تراجم میں ہندی کی صلابت کے ساتھ اُردو کی لطافت اس طرح گھل مل گئی ہے کہ ترجمہ دو آتشہ ہو گیا ہے۔ فکشن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ کتاب ایک قیمتی سوغات سے کم نہیں۔

سلام بن رزّاق

Gehri Jadein

(Urdu translation of Hindi short stories)

Author : **Dr. Neerja Madhav (Varanasi)**

Translator : **Dr. Momin Ghulam Nabi (Kalyan)**

Published by : Momin G. N., R. No. 02, Chaudhari Chawl,
Chaudhari Mohalla, Kalyan - 421301,
Dist. Thane (M.S.) Mob.: 9321259451

Price : Rs. 76/-
2011
Pages : 144

منان گرافکس، پونہ: 26122855

میں بھائی بہن کے تعلقات اور 'ایک اور زندگی' (موہن راکیش)، تیسرا آدمی (منّو بھنڈاری)، اَنر نئے (ممتا کالیا)، پرتی دھونیاں (اوشا پریمبدا) میں میاں بیوی کے ٹوٹتے ہوئے تعلقات کی عکاسی کی گئی ہے۔

نئی کہانی میں انسان دوستی اور سائنسی نقطۂ نظر حاوی ہے۔ ماضی کی فرسودہ روایات اور شکستہ رسمیں آج کے عہد میں اپنی معنویت کھو چکی ہیں، اسی لیے انھیں ترک کر دینا چاہیے۔ اَن جدید رجحانات کا اظہار نئی کہانی میں ہوا ہے۔ نئی کہانی کو امر کانت، اوشا پریمبدا، کرشن بلدیو وید، کرشنا سوبتی، کملیشور، راجندر یادو، موہن راکیش، دھرم ویر بھارتی، بھیشم ساہنی، پھنیشور ناتھ رینو، منّو بھنڈاری، مارکنڈے وغیرہ زبردست کہانی کاروں کی نسل نے بہت بلندی تک پہنچایا ہے۔ اس دور میں جینندر، یشپال، اشک، وشنو پربھاکر، امرت لال ناگر وغیرہ پرانے لکھنے والے بھی اپنے ڈھنگ کی نئی کہانیاں لکھ رہے تھے۔

۱۹۶۰ء کے بعد برصغیر کے حالات اس تیزی سے بدلے کہ نئی کہانی کا جادو غائب ہونے لگا۔ سماجی عدم مساوات، زندگی کے تضادات، لوگوں کی خود غرضی، عدم تحفظ، بیروزگاری، علیحدگی پسندی، تنہائی، محرومی اور خوف کے احساسات شدید ہو گئے تو نئی نسل میں ان حالات کے خلاف غصہ اور بغاوت بھی شدید ہو گئی۔ نئی کہانی کے موضوعات اور اسلوب کی روایتوں کو توڑتے ہوئے مختلف فنکاروں نے الگ الگ اسلوب اختیار کیا جو کہانی کی مختلف تحریکوں کے روپ میں دکھائی دیتی ہے جیسے اَکہانی (غیر کہانی)، ۱۹۶۰ء کے بعد کی کہانی، باشعور کہانی، عملی کہانی وغیرہ۔ آسانی کے لیے ان ساری کہانیوں کو 'عصری کہانی' کہا جا سکتا ہے۔ عصری کہانی کی روایت کو مستحکم کرنے والوں میں چند اہم نام یہ ہیں: اچلا شرما، عبدل بسم اللہ، اشوک اگروال، اصغر وجاہت، کرشنا اگنی ہوتری، گووِند مشر، چترا مدگل، جتیندر بھاٹیا، دیپتی کھنڈیلوال، منجُول بھگت، ممتا کالیا، مہیپ سنگھ، مالتی جوشی، مرینال پانڈے، مِردُولا گرگ، راجی سیٹھ، سدھا اروڑہ، سوریہ بالا وغیرہ۔

ہندی کہانی میں ہر دور میں عورت کا روپ بدلتا رہا ہے لیکن سب سے زیادہ تبدیلی ۱۹۶۰ء کے بعد کی کہانیوں میں دِکھائی دیتی ہے۔ عصری کہانی میں عورت کو زیادہ آزاد دِکھایا گیا ہے کیونکہ

اب عورت احساسِ جرم و گناہ سے بھی آزاد ہوگئی ہے اور پتی ورتا دھرم کے پالن کے لیے مجبور بھی نہیں ہے۔ عصری کہانی میں جنس کے بارے میں کھل کر اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ یہاں ہر قسم کے جسمانی تعلقات کا ذکر ہے خواہ شادی سے پہلے کے ہوں یا بعد کے۔ عصری کہانی کی عورت خوددار، خود اعتماد اور خود کفیل ہے۔ وہ اپنی جنسی ضرورتوں کے لیے یقیناً مردوں پر انحصار کرتی ہے لیکن اسے یہ احساس اور یقین بھی ہے کہ اسے مرد کی جتنی ضرورت ہے مرد کو بھی اس کی اتنی ہی ضرورت ہے۔ اس لیے عورت، مرد سے مساوات کا مطالبہ کرتی ہے۔

عصری کہانی میں ہر طبقے کی عورتوں کی زندگی کی عکاسی کی گئی ہے۔ بعض فنکاروں نے اعلیٰ سوسائٹی کی عورتوں کی نفسیات اور ان کے جدید خیالات کو موضوع بنایا ہے، مثلاً ہوا (دیپتی کھنڈیلوال)، آہٹیں (مرینال پانڈے)، پاؤ روٹی اور کٹ لیٹس (منجولا بھگت) وغیرہ کہانیاں۔ بعض کہانیوں میں متوسط طبقے کی عورتوں کے خوابوں، ناکامیوں، بدحالی، نااُمیدی، درد، بیچارگی، بے اطمینانی، غصّے، جنسی تعلقات وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔ مثلاً آہٹ (کرشنا)، اونچے موڑ سے الگ (راجی سیٹھ)، پیاس (مینا اگروال)، وِترِشنا (مِردُلا گرگ)، اکیلی (منو بھنڈاری) وغیرہ۔ بعض کہانی کاروں نے نچلے متوسط طبقے کی معاشی بدحالی، استحصال اور غربت کو موضوع بنایا ہے۔ کرشنا اگنی ہوتری نے 'ٹپرے والا'، 'ٹری' جیسی کہانیوں میں بتایا ہے کہ اس طبقے کی عورتیں معاشی تحفظ چاہتی ہیں تاکہ ان کا جنسی استحصال نہ کیا جائے۔ سَمی ہرشیتا کی کہانی 'وِرودھ' میں نچلے طبقے کی عورتوں کے بندھنوں سے آزاد ہونے کی زبردست خواہش کا اظہار پایا جاتا ہے۔ بعض کہانیوں میں عورتوں کا استحصال کرنے والوں کے خلاف آواز اُٹھائی گئی ہے جیسے آسمان کتنا نیلا (گووِند مشر)، خدا کی واپسی (ناصرہ شرما)، نیا زمانہ (چندر کشور جائسوال) وغیرہ۔

حقوقِ نسواں کی حمایت میں سب سے جاندار اور سخت آواز میترےئی پشپا کی کہانیوں میں سنائی دیتی ہے۔ 'عذرداری' میں ایک مصیبت زدہ بیوہ اپنے جیٹھ جیٹھانی کے دولت ہڑپنے کے سلسلے میں کی گئی زیادتیوں اور منصوبوں کو ناکام بنانے کے لیے عدالت کا دروازہ کھٹکھٹاتی ہے۔ 'بچھڑے ہوئے' کی ہیروئین اپنی تمام ضرورتوں اور لاچاریوں کے بعد اس 'مرد' کو اپنانے سے

انکار کر دیتی ہے جو زندگی کے ایک مرحلے پر اسے دھوکہ دے کر بھاگ گیا تھا۔ 'فیصلہ' کی بسؤمتی تو گھر کی چہار دیواری میں رہ کر ہی اپنے شوہر کے خلاف اپنا ووٹ استعمال کر کے پنچایت چناؤ کا رُخ بدل دیتی ہے۔ ششی پربھا شاستری نے اپنی بیشتر کہانیوں میں جنسی تعلقات کو موضوع بنایا ہے۔ اندؤبالی نے اپنی کہانیوں میں عموماً پڑھی لکھی عورتوں کے مسائل کی عکاسی کی ہے۔ اس عہد کی عورت اپنے علیحدہ وجود کی شناخت پر اصرار کرتی ہے جیسا کہ 'فیصلہ' کی بسؤمتی، وِبھارانی کی کہانی 'چل خسرو گھر آپنے' کی ہیروئین، مرینال پانڈے کی کہانی 'ایک تھی ہنس مکھ دے' کی ہیروئین وغیرہ۔

اس سرسری جائزے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہندی کہانیوں کے ارتقا میں خاتون فنکاروں کا حصہ بھی بہت وقیع ہے۔ ان کی کہانیاں کسی بھی لحاظ سے مرد کہانی کاروں کی کہانیوں سے کمتر نہیں ہیں۔

* * *

کتابیات:

१) आखिरी दशक की कहानी – ओमा शर्मा (मासिक 'अक्षरा' भोपाल. अक्तोबर–दिसंबर २०००)
२) हिन्दी कहानी में प्रेम : परम्परा और प्रवृत्तियाँ – राजेन्द्र सक्सेना
३) साठोत्तर हिन्दी कहानी : उपलब्धि और प्रयोग – डॉ. जितेंद्र वत्स
४) कहानी की संवेदनशीलता : सिध्दान्त और प्रयोग – डॉ. भगवानदास वर्मा
५) महिला कहानीकार : प्रतिनिधि कहानियाँ – संपादक : डॉ. पुष्पाल सिंह (महिला लेखन : कुछ बातें)
६) कथा–दर्पण – पुष्पाल सिंह
७) साठोत्तर हिन्दी कहानी में पात्र और चरित्र – चित्रण – डॉ. राम प्रसाद

پُنّو کے دار جی

آج بیساکھی ہے، پنو کے دار جی۔ لو، یہ بسنت مالتی کے پھولوں کی مالا پہنو۔ اچھا، ایک پل رُکو۔ میں ذرا وہ اسٹول کھینچ کر لے آؤں۔ تمھاری تصویر بہت اونچائی پر ٹنگی ہے نا۔ کتنی بار بلوِندر سے کہا کہ ذرا نیچے کر دے لیکن وہ سنتا کہاں ہے۔ اب اسے ڈانٹ نہیں پاتی۔ وہ بھی تو بال بچوں والا ہوگیا ہے — بڑے بڑے بچے۔ اب تو ان سب کی بھی شادی ہوچکی ہے۔ ان کے بھی ننھے ننھے کلکاری بھرتے چھَونے (بچّے) ہیں۔

دیکھو، تم صرف تین لوگوں کا کنبہ چھوڑ کر گئے تھے اور میں نے اسے تیرہ کا کر دیا ہے۔ پنو اپنے شوہر اور تین بچوں کے ساتھ اپنی سسرال میں خوش ہے۔ اس کی بڑی بیٹی کے بھی دو بیٹے ہوگئے ہیں۔ بلوِندر کو بھی دو بیٹے ہی ہوئے ہیں اور اب تو دونوں کی شادی بھی ہوچکی ہے۔ بڑے والے کو ابھی پچھلے سال ہی گلہری کی طرح گول گول چمکیلی آنکھوں والی ایک پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ اس سے بڑا والا بیٹا ٹنکو اسکول جانے لگا ہے۔

خاندان بڑھنے لگا تو کمرے کم پڑنے لگے۔ سو میں نے ہی کہا کہ میرا تخت کونے والے کمرے میں ڈال دو۔ بس گیہوں چاول کے دو چار ڈرم ہی تو وہاں رکھے ہیں۔ پھر گرو گرنتھ صاحب بھی تو اسی کمرے میں ہیں۔

پنو کے دار جی! پیچھے والی کھڑکی ہمیشہ کھولے رکھتی ہوں۔ صاف ہوا بھی آتی ہے اور آتے

جاتے لوگوں کو دیکھ کر جی بھی بہلتا رہتا ہے۔ دوسری منزل سے دیکھنے پر لگتا ہے کہ سڑک پر آنے جانے والے لوگ تیزی سے کہیں بھاگے جا رہے ہیں۔ وہی ہڑبڑاہٹ جو آزادی کی لڑائی کے دنوں میں اکثر دِکھائی پڑتی تھی۔

محسوس ہی نہیں ہوتا کہ کتنے دن بیت گئے۔ لگتا ہے کہ ابھی کل ہی کی بات ہے۔

اس دن بلوِندر کے بڑے بیٹے سکھجندر کی بہو اپنے بیٹے ٹِنکو کی سفید والی ڈریس رگڑ رگڑ کر دھو رہی تھی۔ بلوندر کا چھوٹا بیٹا پُپریت دوڑا ہوا گلی کے کونے والی دکان پر گیا تھا۔ انگوٹھا لہولہان ہو گیا تھا۔ سبھی لوگ دوا لگانے کی تیاری کر رہے تھے۔ میں نے بھی دیکھا تھا۔ خون کی سرخ دھار دھیرے دھیرے بہہ رہی تھی —— بالکل وقت کی طرح۔ میں نے اپنی اُنگلی سے اس کا خون پونچھا اور اپنے ماتھے اور ہونٹوں سے لگا لیا تھا۔ اس وقت ایسا لگا جیسے تم سامنے کھڑے ہو۔ آخر یہ لہو بھی تو تمھارا ہی ہے نا جوان بچوں کے تن میں بہہ رہا ہے!

جانے کیوں سکھجندر غصّے میں چیخ پڑا تھا پنو کے دار جی! کہہ رہا تھا ’دادی جی کا پاگل پن بڑھ رہا ہے۔‘‘

بلوندر نے بھی اسے نہ ڈانٹا۔ بس اتنا ہی بولا تھا، ’’ماں کی عمر زیادہ ہو گئی ہے، اسی لیے ذہنی حالت ٹھیک نہیں ہے۔‘‘

اور میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے کوٹھری میں پہنچا آیا تھا۔

پنو کے دار جی! میں بالکل ٹھیک ہوں۔ میرا دماغ خراب نہیں ہوا ہے۔ دیکھیے نا جب ننھا ٹِنکو سفید ڈریس پہن کر مجھے دِکھانے آیا تھا تو میں نے پوچھا تھا، ’’آج کیا ہے پُتّر جی؟‘‘ تو اس نے بتایا تھا ’’آج پندرہ اگست ہے دادی ماں۔ ہماری آزادی کی پچاسویں سالگرہ۔‘‘

میں نے اُنگلیوں پر دھیان سے گنا تھا پنو کے دار جی! تمھیں گئے اٹھہتر سال بیت چکے ہیں۔ میں ٹھیک گن رہی ہوں نا پنو کے دار جی؟

تم تصویر میں بھی ہنس رہے ہو۔ ہاں، ہاں، مجھے حساب اس وقت بھی کہاں آتا تھا۔ کوئی بھی حساب کرتی تھی تو تمھیں دِکھا کر۔ تم سے ہامی بھروائے بغیر میں مطمئن نہیں ہوتی تھی۔

© جملہ حقوق بحق مترجم محفوظ

کتاب کا نام : گہری جڑیں (ہندی کہانیوں کا ترجمہ)
مصنفہ : ڈاکٹر نیرجا مادھو (بنارس)
مترجم : ڈاکٹر غلام نبی مومن (کلیان)
انتخاب و ترتیب : محمد حسن فاروقی
سن اشاعت : فروری ۲۰۱۱ء
تعداد : ۵۰۰
قیمت : ۷۶/روپے
کمپیوٹر کمپوزنگ : مدنی گرافکس، پونے (26122855)
طابع : پربھات پرنٹنگ ورکس، پونے
ناشر : غلام نبی مومن، روم نمبر ۲، چودھری چال، چودھری محلّہ،
کلیان-۴۲۱۳۰۱ ۔ضلع تھانہ (مہاراشٹر) 9321259451

ملنے کے پتے : ۱۔ سیفی بک ایجنسی، ۱۱-امین بلڈنگ، ابراہیم رحمت اللہ روڈ،
بھنڈی بازار، ممبئی-۴۰۰۰۰۳
۲۔ مدنی گرافکس، شاپ نمبر ۵، انامئے بلڈنگ،
۳۰۵-سوموار پیٹھ، پونے ۴۱۱۰۱۱

(یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی کے جزوی مالی تعاون سے شائع کی گئی ہے۔)

بس اسی دن تم نے ہامی نہیں بھری تھی پنو کے دار جی۔ تم اکیلے ہی چلے گئے تھے جلیان والے باغ میں۔ میں نے کتنا کہا تھا کہ میں بھی جلسہ دیکھنے چلوں گی مگر تم ہنس پڑے تھے، ایسے ہی جیسے ابھی ہنس رہے ہو۔ کہا تھا، ''عورتیں وہاں نہیں آئیں گی۔''

''کیوں؟ کیا ہوگا؟'' میرے اس سوال پر تم سنجیدہ ہوگئے تھے اور بولے تھے، ''کچھ بھی ہوسکتا ہے۔''

اور تم مجھے بیساکھی کے تہوار کی خوشیاں منانے کی ہدایت دے کر چلے گئے —— اسی امرتسر کی چوڑی سڑک پر۔ میں چھت سے تمھیں اس اندھے موڑ تک جاتے ہوئے دیکھتی رہی تھی جہاں وہ پیپل کا پیڑ آج بھی ہے۔ بس فرق اتنا ہوا کہ اس وقت وہ چھوٹا سا پودا تھا اور آج بہت پرانا ہوگیا ہے۔ ہاں، ان اُٹھہتر برسوں کے دوران ایک بار گر گیا تھا، تیز آندھی اور بارش میں لیکن پھر بقیہ جڑوں میں سے ایک نیا جیون نکل آیا تھا بالکل میری طرح۔

میں بھی تو اس وقت صرف اُنیس برس کی تھی۔ پنو دو برس کی اور بلوندر چھ مہینے کا میرے پیٹ میں تھا۔

وہ خبر آگ کی طرح امرتسر میں پھیلی تھی اور سبھی لوگ ڈر سے گھروں میں دبک گئے تھے۔ کوئی کچھ بول نہیں رہا تھا۔ چاروں طرف شمشان جیسا سناٹا چھا گیا تھا۔

باہر سے ساسو جی پنو کو گود میں لیے لڑکھڑاتی ہوئی گھر میں گھسی تھیں اور پوچھا تھا —— ''پنو کی ماں، پرم جیت کہاں گیا ہے؟''

''جلیان والے باغ میں کوئی جلسہ ہو رہا ہے، اسے سننے ....''

سب کچھ جانتے ہوئے بھی شاید وہ یہ جواب سننا نہیں چاہتی تھیں۔ پنو کو لیے ہوئے وہ دھم سے زمین پر بیٹھ گئی تھیں۔ ان کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا۔ میں گھبرا گئی تھی۔ جھنجھوڑتے ہوئے پوچھا تھا ——

''کیا ہوا ماں جی؟ کیا ہوا؟''

''وہاں گولی چل رہی ہے۔'' کہتے ہوئے وہ دیوار سے ٹک کر بے ہوش ہوگئی تھیں۔

''واہے گرو! پنو کے دار جی کی رَکشا کرنا۔''

میں دوڑتے ہوئے گرو گرنتھ صاحب کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ دماغ اُڑا جا رہا تھا۔ آنکھوں سے آنسو نکل نہیں پا رہے تھے، ہونٹ سوکھ رہے تھے اور میں دوپٹے سے سر کو ڈھانکے واہے گرو سے تمھاری جان کی حفاظت کی بھیک مانگ رہی تھی۔ دعا کے لیے اُٹھے ہوئے میرے ہاتھ تھرتھر کانپ رہے تھے۔ پورا جسم پیپل کے پتے کی طرح ہل رہا تھا۔ پیٹ میں بلوندر مچھلی کی طرح تیر رہا تھا۔

تم روز اپنا سر میرے پیٹ پر لگا کر اس کی اچھل کود کو محسوس کرتے تھے اور ہنستے تھے لیکن اس دن اس کی ہلچل مجھے اچھی نہیں لگ رہی تھی۔ میں بدحواس ہوکر اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرنے لگی تھی۔

''میرے بیٹے! تم پر ابھی دنیا کی کالی چھایا نہیں پڑی ہے۔ ابھی تو ایشور کا روپ ہے۔ اپنے دار جی کی رَکشا کے لیے دعا کر بیٹے۔''

آنکھیں برس رہی تھیں۔ دوڑ کر بالکنی میں سے بغل والے گھر میں جھانکنے کی کوشش کی تھی۔ بغل والے سبھر وال جی بھی تو تمھارے ساتھ گئے تھے۔

سامنے والے پارک میں نظر گئی۔ بیساکھی کا جوش تھم گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے تک ڈھول اور تاشے پر بھانگڑا کرتے ہوئے لڑکوں کا اب کہیں اتا پتا نہیں تھا۔ سب اپنے گھروں کو واپس چلے گئے تھے۔ مرگھٹ جیسا سناٹا چھا گیا تھا۔

میری آنکھیں گلی کے اس اندھے موڑ پر ٹکی تھیں۔ دل کو اُمید تھی کہ شاید تم صحیح سلامت واپس آ جاؤ۔ بغل والے سبھر وال جی بدحواس سے بھاگتے ہوئے آتے دِکھائی دیے۔ دل میں اُمید کی ایک کرن چمکی اور فوراً بجھ گئی تھی۔ تم ان کے ساتھ نہیں تھے پنو کے دار جی۔

پیٹ کا خیال کیے بغیر میں دھڑ دھڑ سیڑھیاں اُتر کر ان کے سامنے جا کر کھڑی ہو گئی تھی —— ''پنو کے دار جی کہاں ہیں؟''

میرے ہونٹ میکانکی انداز میں پوچھ رہے تھے اور پورا جسم چکری کی طرح گھومتا محسوس ہو رہا تھا۔

''کچھ پتہ نہیں۔ بہت لوگ مارے گئے ہیں۔ اس وقت میں بھیڑ کی وجہ سے پیشاب کرنے کچھ دور چلا گیا تھا....''

سبھر وال جی ہانپتے ہوئے بتا رہے تھے۔ ان کی بیوی باہر آئیں اور انھیں جھٹ سے کھینچ کر گھر کے اندر لے گئیں۔

میں کچھ دیر تک وہیں بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر ننگے پاؤں ہی گلی کے اس اندھے موڑ تک دوڑ گئی تھی لیکن راستہ معلوم نہ تھا۔ اسی وقت نہ جانے کہاں سے وہ بگھی والا آ گیا تھا۔

''ویر جی، وہ جلیان والا باغ کدھر ہے....؟'' میں گھبراہٹ میں اس سے پوچھ رہی تھی۔

''کیا...؟ پاگل ہوگئی ہو بی بی...؟ کیا تمھیں پتہ نہیں ہے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے؟'' بگھی والے نے گھوڑے کو روکنے کے لیے دھیرے سے لگام کھینچ لی تھی۔

''بتا دو ویر جی۔ میرے پنو کے دار جی وہیں گئے ہیں....''

میں ہاتھ جوڑے گڑگڑا رہی تھی۔ امرتسر کی ایک دو سڑکوں کو چھوڑ کر میں اور کچھ بھی تو نہ جانتی تھی پنو کے دار جی۔

''لیکن بی بی، تمھاری یہ حالت...؟ اور تم وہاں جا کر کیا کرو گی؟ خطرہ ہے...'' بگھی والا نیچے اُتر آیا تھا۔

بغیر سوچے سمجھے میں جھپٹ کر بگھی میں سوار ہوگئی تھی۔

''ویر جی! بس مجھ پر اتنی مہربانی کر دو۔ وہاں پہنچا دو۔ واہے گرو، تمھارا یہ قرض مجھ پر زندگی بھر رہے گا....''

میں بدحواس سی تھی۔

''....لیکن بی بی، گھر میں کوئی مرد ہو تو اسے....''

''کوئی نہیں ہے ویر جی۔ بس ساسو ماں ہیں۔ وہ بھی بے ہوش ہیں۔ چلو ویر جی.... دیر نہ ہو جائے۔''

میں نے بگھی والے کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑ دیا تھا۔

''چلو بی بی، تمھارے سہاگ کی خاطر میں خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔''

بگھی سڑک کی چھاتی پر دوڑ پڑی۔ گھوڑے کی ٹاپوں کی ٹک ٹک سے سناٹا ٹوٹ رہا تھا۔

''وہ دیکھو.... بی بی۔ وہی ہے جلیان والا باغ۔''

اس نے دور ہی سے دِکھایا تھا۔ میرا دل چیخ اُٹھا تھا۔ نہ جانے کس حال میں ہوں گے پنو کے دار جی۔ ایک خیال آیا کہ ذرا بھی سانس باقی ہوگی تو انھیں اسی بگھی پر لاد کر اسپتال لے جاؤں گی لیکن دوسرے ہی پل دل میں اُمید نے کروٹ لی ——

ہوسکتا ہے وہ بچ ہی گئے ہوں۔ واہے گرو کی مہربانی....

میں نے دعا کے لیے اپنے ہاتھ اُٹھا دیے تھے۔ آنکھیں بند کر کے میں پرارتھنا کرنے لگی تھی۔

''....او یَین اِدر کہاں؟''

میں نے چونک کر آنکھیں کھول دی تھیں۔ ایک گورا سپاہی بگھی والے پر دہاڑ رہا تھا۔

ہمیشہ سے گورے لوگوں کی شکل دیکھ کر ہی گھر میں چھپ جانے والی میں، اس دن ذرا بھی نہیں ڈری تھی پنو کے دار جی۔ نہ جانے کہاں سے مجھ میں ہمت آ گئی تھی۔ میں بگھی سے نیچے اُتر آئی تھی اور سپاہی کی آنکھوں میں شیرنی کی طرح دیکھتے ہوئے کہا تھا —— ''میرے سردار جی باغ میں آئے تھے۔ مجھے ان کے پاس جانا ہے۔''

''اوہ.... شٹ اپ۔ جانتھا نئیں.... کھیا ہوا ہے....؟ گو بیک۔''

پولس والے کی باتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے میں دوڑ کر باغ کی طرف جانے لگی تو پولس والے نے جھپٹ کر مجھے پکڑنے کی کوشش کی تھی لیکن میں اسے دھکّا دیتے ہوئے نکل گئی تھی۔ میرا دوپٹہ اس کا ہاتھ لگنے سے سڑک پر جا گرا تھا۔ تب تک سامنے سے چار سپاہی اور آ گئے پنو کے دار جی۔ لیکن میں ڈری نہیں۔ ان لوگوں نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں رُکی نہیں۔ جوں ہی ایک گورے سپاہی نے پیچھے سے دوڑ کر مجھے کندھوں سے پکڑنا چاہا تھا، میں نے کھینچ کر ایک چانٹا اس کے گال پر جڑ دیا تھا۔ وہ تلملا کر پیچھے ہٹا تھا، تبھی بگھی والے نے پیچھے سے دوڑ کر اسے پیر سے

ایک زوردار ٹھوکر ماری اور چلایا تھا، ''سالے، کتوں کی اولاد! ہماری بہن بیٹیوں کی عزّت پر ہاتھ ڈالتا ہے۔''

جانتے ہو پنو کے دار جی؟ اس وقت میری طاقت دگنی ہوگئی تھی لیکن تب تک کئی سپاہی مل کر بگھی والے کو ہنٹروں سے پیٹنے لگے تھے۔ میں بدحواس سی کھڑی دیکھ رہی تھی۔ میرے سامنے ہی میرا منہ بولا ویر جی پٹ رہا تھا اور میں کچھ نہیں کر پا رہی تھی۔ ایک سپاہی نے میرا ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے جھک کر تیزی سے اس کے ہاتھ میں اپنے دانت گڑا دیے تھے۔ بلبلا کر اس نے میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔ میں تیزی سے بگھی والے کی طرف دوڑی تھی اور اوندھے منہ گر پڑی تھی۔ حمل کی وجہ سے فوراً اُٹھ نہیں پا رہی تھی۔ تب تک پولس والوں نے مجھے اُٹھا کر بگھی میں پھینک دیا تھا اور بگھی والے کو ڈھکیلتے ہوئے کہا تھا —

''گو! اس لیڈی کھو اِس کھے گھر پہنچاؤ۔''

دیکھو نا پنو کے دار جی! میری آنکھیں آج پھر اس دن کو یاد کر کے بھر آئی ہیں۔ تمھاری تصویر دھندلی دِکھائی پڑ رہی ہے۔ رُکو، ذرا آنکھیں پونچھ لوں۔ نہ جانے کتنے آنسو چھپائے ہیں میں نے اس آنچل میں لیکن ہر روز یہ سوکھ جاتا ہے۔

لیکن اس دن تو آنسو ہی سوکھ گئے تھے۔ جب دوسرے دن تک تم واپس نہیں آئے تھے تو دل کو سچائی کا احساس دلا دیا تھا میں نے۔

سننے میں آیا تھا کہ تمام لاشوں کو باغ ہی میں بنے ہوئے کنویں میں ڈال کر آگ لگا دی گئی تھی۔ نہ جانے کتنے بے نام انقلابیوں کو اس کنویں نے اپنی گود میں سمو لیا تھا۔

تب سے لے کر آج تک میں تمھاری چھوڑی ہوئی ادھوری زندگی جی رہی ہوں پنو کے دار جی۔ اب تو لگ بھگ ستانوے برس کی ہو چکی ہوں۔ آنکھوں سے دِکھائی بھی نہیں پڑتا۔ دن کے اُجالے میں تھوڑا بہت دِکھائی دیتا ہے۔

بہت کام بھی تو لیا ہے ان آنکھوں سے۔ تمھارے نہ رہنے پر گھر کا بوجھ میرے اوپر ہی تو آ گیا تھا۔ بلوِندر چھوٹا تھا۔ ساسوں ماں پاگل سی ہوگئی تھیں۔ بلوِندر اور پنو کو دیکھ کر ان کے دِل کو

ڈھارس ہوتی تھی۔

میں پاس پڑوس والوں کے کپڑے سی کر کسی طرح گھر چلا رہی تھی۔ تمھارے ساتھ اور نہ جانے کتنے شہید ہوئے تھے۔ انھیں چتا نہیں ملی تھی اور نہ ہی تمھیں۔ لیکن وہ چتا مسلسل میرے دِل میں سلگ رہی تھی۔ نہ جانے جوش کے کن لمحوں میں مَیں بھی خاموشی کے ساتھ تحریک سے جڑ گئی تھی۔

میں نے چرخہ کاتنے اور انقلابیوں کو جھنڈے سی کر دینے کا کام شروع کر دیا۔ رات کے اندھیرے میں دِیے کی مدھم روشنی میں مَیں انھیں سی کر پریس کرتی۔ انھیں کپڑوں کے بنڈل میں چھپا کر مقررہ جگہ پر پہنچا آتی۔ دل کو بہت سکون ملتا تھا پنو کے دار جی۔ تمھاری ادھوری زندگی ہی نہیں، ادھوری خواہش کو پورا کرنے کا سکون۔

ملک آزاد ہوا۔ چاروں طرف خوشیاں ہی خوشیاں تھیں۔ بیساکھی آئی تو تم لوگوں کی یاد بھی تازہ ہو اُٹھی تھی۔ آزاد ملک میں پہلی بیساکھی۔ تمھاری تصویر کے سامنے کھڑے ہوکر میں گھنٹوں روئی تھی پنو کے دار جی۔ بالکل آج کی طرح۔ ہر بیساکھی جیسے اسی طرح لگتی ہے۔ ہر پل دل بیٹھتا ہوا سا محسوس ہوتا ہے۔ لگتا ہے جیسے ابھی ابھی یہ جوش وخروش تھم جائے گا۔ الاؤ کے گرد ڈھول اور تاشے پر بھانگڑا کرتے ان نوجوانوں کا جوش ٹھنڈا پڑ جائے گا اور پھیل جائے گا ایک بے معنی سناٹا۔ سنائی دے گی بس ہوا کی سائیں سائیں کی گونج۔

ہماری آزاد حکومت نے باغ میں شہید ہونے والے گمنام انقلابیوں کی سدھ لی تھی۔ ان کے نام اور پتے منگوائے گئے تھے۔ بہتوں نے دیے، بہتوں نے نہیں دیے۔ ان کے بارے میں پاس پڑوس سے پوچھ کر جانکاری لی گئی۔ مجھے بھی پتہ نہیں چلا کہ تمھارا نام پتہ کس نے درج کروایا۔

وہ تو جب سرکاری چٹھی ملی کہ اگر چاہیں تو پنشن حاصل کرنے کے لیے دعویٰ کریں تب میں نے جانا۔ لیکن میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا پنو کے دار جی۔ تمھاری قربانی کو چند روپیوں کے لیے بھنانا نہیں چاہ رہی تھی۔ بلوِندر کو انگریزی حکومت میں ہی بابو کی نوکری مل رہی تھی لیکن میں

نے کرنے نہیں دیا۔ جس کے ظلم نے میرا سہاگ اُجاڑا، اسی کی ماتحتی میں میرا بیٹا نوکری کرے، یہ مجھے گوارا نہ تھا۔

لیکن زمانہ تیزی سے بدل رہا ہے پنو کے دار جی۔ تم بھی ہوتے تو میری طرح ہی محسوس کرتے۔ لگ بھگ ویسا ہی ظلم اب ہر روز کہیں نہ کہیں ہو رہا ہے۔ ہر روز کسی نہ کسی کی مانگ اُجڑ رہی ہے۔ ہر روز کسی نہ کسی کے معصوم لال کی لاش ندی نالے، تالاب یا کنویں میں تیرتی ہوئی مل رہی ہے۔ بس فرق صرف اتنا ہے کہ یہ ظلم ڈھانے والے باہر کے لوگ نہیں ہیں۔

ایک دن بلوِندر کا بیٹا سکھجندر میری کوٹھری میں آیا اور بڑے پیار سے میرا پیر سہلانے لگا۔ میری ممتا اُمڈ پڑی تھی۔ آخر اپنا ہی خون تو ہے۔ میں نے فخر سے تمھاری تصویر کی طرف دیکھا تھا۔ تم اس وقت بھی اسی طرح مسکرا رہے تھے۔

تمھاری اس مسکراہٹ میں نہ جانے کتنے احساسات چھپے ہوئے ہیں پنو کے دار جی کہ ان کا مطلب کچھ وقت گزرنے کے بعد ہی سمجھ میں آتا ہے۔ میں نے پیار سے سکھجندر کا سر سہلاتے ہوئے پوچھا تھا——

’’کیا بات ہے پتر جی؟ آج دادی پر اتنا پیار کیوں آ رہا ہے؟‘‘

میرا پیر سہلاتے ہوئے اس نے کہا تھا——

’’دادی، میرے ساتھ چل کر ذرا مجاہدِ آزادی کا سرٹیفکیٹ لے لو نا۔‘‘

میں چونک پڑی تھی۔ ویسے تو یہ سکھجندر کبھی میرے پاس نہیں بیٹھتا۔ آج اچانک اس کام کے لیے اتنی نرمی سے بات کر رہا ہے۔ میں نے پوچھ ہی لیا——

’’پتر! جب اس وقت میں نے سند نہیں لی تو اب بڑھاپے میں لے کر کیا کروں گی؟‘‘

اس نے دوبارہ کہا، ’’دادی، لے لو۔ مجاہدینِ آزادی کو بھی کچھ فی صد ریزرویشن ملتا ہے۔‘‘

تمھارے اندر صلاحیت ہوگی تبھی تو ریزرویشن ملے گا پتر جی؟ پڑھائی لکھائی میں پیچھے رہو گے تو یہ سب کیسے ہو پائے گا۔‘‘

”لیکن دادی، پڑھائی میں پیچھے ہونے پر بھی اس سے ....“

وہ چپ ہوگیا تھا۔ میں اس کی بے وقوفی پر ہنس پڑی تھی۔ لیکن پنو کے دار جی، نادان وہ نہیں، میں تھی۔ میں نے سمجھا تھا کہ یہ ریزرویشن کوئی ٹریننگ ہے جس سے نوکری آسانی سے ملتی ہے لیکن جب بلوِندر نے سمجھایا تو میں تھوڑی فکرمند ہوگئی۔ تم بھی ہوتے تو فکرمند ہوجاتے۔ یہ بات تو تم سمجھ ہی رہے ہو۔

اسی دن میری سمجھ میں پوری طرح آیا تھا کہ کچھ برس پہلے نہ جانے کتنے لڑکے لڑکیوں نے اسی کی مخالفت میں خودسوزی کی تھی۔ ہائے، ہائے کرکے رہ جاتی تھی میں۔ بلوِندر روز اخبار پڑھ کر سناتا تھا۔ نہ جانے کتنے بچوں نے اپنی بات منوانے کے لیے اپنے آپ کو ختم کرلیا تھا۔ میں نے ایک دن بلوِندر سے پوچھا بھی تھا ——

”اودھم سنگھ نے ڈائر کو ہی مارا تھا نہ پُتّر؟“

”ہاں، ماں! کیوں؟“

”میں سوچ رہی تھی کہیں ڈائر کے دھوکے میں اس نے کسی اور کو —— “

میں فکرمند تھی اور بلوِندر ہنس پڑا تھا۔ کچھ دیر تک ہنستا ہی رہا۔ میں چپ چاپ اس کا منہ تکے جارہی تھی پنو کے دار جی۔ آخر میرے شک پر وہ اتنی زور سے کیوں ہنس پڑا تھا۔

اس رات بھی تو وہ میری بات پر ہنستا ہی رہا تھا جب میں نے اسے جگا کر اپنا شک ظاہر کیا تھا۔ رات کچھ زیادہ ہوگئی تھی۔ ویسے بھی شام سے ہی میرے لیے رات ہوجاتی ہے کیونکہ آنکھوں سے دِکھائی نہیں پڑتا۔ سبھی بچے اپنے اپنے کمروں میں بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ بڑھاپے میں نیند بھی نہ جانے کیوں بیگانی ہوجاتی ہے۔ نعروں کی مدھم آواز گونجی تھی۔ میں نے اپنی چھڑی ٹٹولی تھی اور اس کے سہارے چلتے ہوئے بالکنی میں آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ پڑوس کے گھر کی طرف کان لگا کر سنا تو چونک اُٹھی۔ کچھ ویسا ہی شور اُٹھ رہا تھا جسے سن کر تم خوش ہو اُٹھتے تھے۔ اف! پنو کے دار جی، یاد ہی نہیں آرہا ہے۔ ارے، وہی جسے بولنے سے انگریز چڑ جاتے تھے۔ ہاں، ہاں یاد آگیا —— وندے ماترم .... اتنے برسوں کے بعد پھر وہی نعرہ گونجا تو

میں ڈر گئی تھی۔ کیا پھر انقلاب آ گیا۔ گھبرا اُٹھی تھی۔ سوچا، بچوں کو آگاہ کردوں۔ اندھیرے میں ٹٹولتے ہوئے میں نے بلوِندر کا کواڑ کھٹکھٹایا۔

’’کیا ہے ماں، باہر کیوں کھڑی ہو؟‘‘

پوچھتے ہوئے بلوِندر نے میرا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ڈر سے نہیں پنو کے دار جی بلکہ اس خیال سے کہ کیا ابھی اور قربانی دینا باقی ہے؟ میں نے دھیرے سے پھسپھسا کر بلوِندر کو بتایا تھا——

’’پتر، وہی نعرہ پھر سنائی دے رہا ہے جو پنو کے دار جی کے وقت کہیں کہیں انقلابیوں کے منہ سے سنائی پڑتا تھا۔‘‘

بلوِندر زور سے ہنس پڑا تھا۔ مجھے اچھا لگا تھا۔ کم سے کم میرا بیٹا اپنے دار جی کی طرح نڈر تو ہے جو ایسی مصیبت کی گھڑی میں بھی کھل کر قہقہے لگا رہا ہے۔ میرا دل فخر سے جھوم اُٹھا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں پوچھا تھا——

’’اب ذرا ٹھہر بھی پتر! یہ بتا کیا پھر سے آزادی کی جنگ چھڑ گئی ہے؟‘‘

’’نہیں ماں.... وہ آزادی کی گولڈن جوبلی منائی جا رہی ہے نا۔ اس لیے سب کے ٹی وی سے وہی ایک آواز سنائی دے رہی ہے۔‘‘

بلوِندر نے مجھے پیار سے تھام رکھا تھا اور میرے کمرے کی طرف لے جاتے ہوئے بولا، ’’ماں، ٹی وی پر آزادی کی لڑائی کا ایک ناٹک چل رہا ہے۔‘‘

میں حیران رہ گئی تھی پنو کے دار جی۔ لڑائی کا بھی ناٹک ہوتا ہے! خون دے کر جو آزادی تم لوگوں نے سونپی، اس کا ناٹک ....؟ آزادی کا ناٹک یعنی ابھی ہم سچ مچ آزاد نہیں ہوئے ہیں کیا؟ ہاں، سچ مچ ابھی آزاد نہیں ہوئے ہیں پنو کے دار جی۔ کیونکہ قربانیاں، بلیدان ابھی جاری ہیں۔

نہ جانے کیسا طوفان آیا ہے کہ ہر روز کسی نہ کسی قصبے، گاؤں، ٹرین یا بس میں جلیان والا باغ زندہ ہو اُٹھتا ہے۔

بلوِندر آ کر بتا تا ہے تو میں تمھاری تصویر کے سامنے کھڑی ہو کر تھر تھر کانپنے لگتی ہوں۔ اب تو کوئی اودھم سنگھ نظر نہیں آ تا۔ ہر روز کسی نہ کسی بیٹی کا آنچل تار تار ہوتا ہے لیکن کوئی بگھی والا ویر۔جی سامنے نہیں آ تا۔ ایک زلزلہ سا آیا ہوا ہے۔ اب تو لوگوں کے ضمیر نے بھی خودکشی کرنی شروع کردی ہے پنو کے دار۔جی۔

ناٹک .... قتل .... خودکشی .... میرا دل گھبرا رہا ہے پنو کے دار۔جی۔ میرے پیر کانپ رہے ہیں۔ میں اسٹول سے اُتر نہیں پا رہی ہوں۔ مجھے سنبھالو پنو کے دار۔جی۔ دیکھو .... دیکھو .... یہ سکھجندر اور سُپریت مجھے زبردستی اُتار کر لے جا رہے ہیں۔ کہہ رہے ہیں، میں پاگل ہوگئی ہوں۔ پنو کے دار۔جی! میں پاگل نہیں ہوئی ہوں۔ بس ناٹکوں، ہتیاؤں، خودکشیوں سے گھبرا رہی ہوں۔ مجھے سنبھالو پنو کے دار۔جی۔

* * *

انتساب

میں اپنی اس ادبی کاوش کو
مشہور ماہر تعلیم
محترمہ نور العین علی صاحبہ
(سابق لیکچرار، ایس ٹی کالج آف ایجوکیشن، ممبئی اور
سابق چیئر پرسن، اُردو لسانی کمیٹی، بال بھارتی، پونہ)
کے نام معنون کرتا ہوں جنھوں نے
عورتوں کے مختلف مسائل پر کئی معیاری ڈرامے تحریر کیے اور
جن کی درسیات کی تیاری کی بے پناہ صلاحیت اور تجربے سے
میں نے بہت فیض حاصل کیا۔

خاکسار
غلام نبی مومن

گہری جڑیں

دفتر کے ایک کمرے میں بیٹھی ہوئی وِدیوتما ہاتھ میں قلم لیے کچھ سوچ رہی تھی۔ بے چینی کے لمحوں میں اکثر وہ نظمیں لکھنے لگتی اور اس کا سارا اضطراب خود بخود زائل ہوجاتا۔ اس کا دل سرسراتے پتوں اور جھومتے درختوں سے بھی اونچا اُٹھتا ہوا آسمان میں سیر کرتے بادلوں کے بیچ پہنچ کر ایک فلسفی بن جاتا۔ دہی جیسے سفید بادل، سورج کی کرنوں کی مانند سرخ اور سنہرے بادل، کچھ نیلے سیاہ مائل بادل! وہ کون مصوّر ہے جس نے آسمان میں اتنے سارے تارے ٹانک دیے اور دل میں جستجو کی کبھی نہ بجھنے والی پیاس بھر دی؟ پھر لامتناہی، لامحدود تجسّس دھیرے دھیرے نظم میں ڈھلتا چلا جاتا۔ لیکن آج وِدیوتما کا دل نہ تو فطرت کے ان حسین مناظر سے بہل رہا ہے اور نہ ہی اسے سکون مل رہا ہے۔ اس کا دل تو دنیا کی اُلجھنوں اور سازشوں میں گھرا ہوا ہے۔ ایک ایسی سازش جس میں اسے اُلجھا دیا گیا ہے.... اس کانجی ہاؤس کی سازش میں۔ ہاں، آج اسے اپنا دفتر کانجی ہاؤس ہی نظر آرہا ہے۔ یہی نہیں، شاید سبھی دفاتر کانجی ہاؤس میں تبدیل ہوتے جارہے ہیں جہاں آوارہ، اِدھر اُدھر منہ مارنے والے جانوروں کو پکڑ کر رکھا جاتا ہے۔ جانور ہرا چارہ دیکھ کر منہ مارنے لگتا ہے، خواہ پیٹ بھرا ہو یا نہ بھرا ہو۔ اس کانجی ہاؤس کا ہرا چارہ سرکاری بجٹ ہے۔ جب تک نوکری نہیں ملتی بیروزگاری کی حالت میں اسی دفتر کے فرش پر جو شخص جھاڑو لگانے کے لیے بھی تیار رہتا ہے، نوکری پاتے ہی وہ اپنے سیکشن کو بیچ کھانے کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے۔ اوپر

سے نیچے تک خریدنے اور بیچنے والوں کا لمبا سلسلہ ہے۔

کافی کوششوں کے بعد وہ اس محکمۂ فن و ثقافت کی دلدل سے نکلنے میں کامیاب ہو پائی تھی جہاں نہ وہ پرچیز آفیسر بن سکی تھی اور نہ ہی سیلس آفیسر۔ اپنے اعلیٰ افسروں سے اصولوں کے ٹکراؤ میں اپنی پوزیشن کو بچانے کے لیے اس محکمے میں چلی آئی تھی۔ آسمان سے چھوٹ کر دھرتی پر مضبوطی سے پاؤں ٹکا کر چلنے کا اطمینان دل میں لیے ہوئے، لیکن کھجور میں اٹکتے ہی اس کی نکیلی پتیوں کی چبھن سے اس کا سارا جسم لہولہان ہونے لگا تھا۔ آج وِدیوتّما کو محسوس ہو رہا تھا کہ آسمان سے دھرتی تک کا سفر بھی اتنا آسان اور سہل نہیں ہے۔ کھجور سے دھرتی پر پاؤں جمانے کے لیے اسے ایک بار پھر جسم کو پوری طاقت سے کانٹوں پر دباؤ ڈال کر ایک تیز اُچھال بھرنی ہوگی۔ لیکن کیسے؟ کیا تن من میں دھنسی ہوئی کھجور کی نکیلی پتیاں اتنی آسانی سے نکل پائیں گی؟ کیا تب تک اصولوں کی دھرتی تڑخ نہیں جائے گی؟

وِدیوتّما نے قلم میز پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں میں اپنا سر تھام کر، کہنی کو میز پر ٹکا دیا۔

''میڈم، مے آئی کم اِن؟''

وِدیوتّما چونک کر سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ دروازے پر بڑے بابو سی۔ ڈی۔ وِشوکرما کھڑے، خوشامد بھری مسکراہٹ کے ساتھ پوچھ رہے تھے۔

''آجائیے۔ کیا بات ہے؟ .... بیٹھیے۔'' وِدیوتّما نے سامنے کی کرسی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ اس کے چہرے پر اب بھی تناؤ اور افسردگی کی ملی جلی کیفیت چھائی ہوئی تھی۔

''جی، وہ میڈم، او۔ٹی۔اے کا ایک سینکشن لیٹر تھا۔ .... او دِکشت .... چائے ادھر لے آنا۔''

باہر کھڑے چائے والے کو آواز دیتے ہوئے وشوکرما نے او۔ٹی۔اے کا کاغذ وِدیوتّما کے سامنے پھیلا دیا۔

''نہیں، آپ باہر جا کر چائے پی لیجیے گا۔ اپنا کام بتائیے۔'' وِدیوتّما نے ذرا روکھے انداز میں کہا۔

تب تک چائے والا اندر آ چکا تھا۔ وشوکر ما نے اپنی آواز میں خوشامد کی پڑیا گھولتے ہوئے کہا ''ارے میڈم، نیا آیا ہوں تو کیا ہوا، اپنے افسروں کے موڈ اور عادتوں کے بارے میں پہلے ہی جانکاری لے چکا ہوں۔ آپ چائے پیتی ہیں۔ پلیز میڈم! چھوٹا بھائی ہوں۔ آپ سے چھوٹے عہدے پر ہوں لیکن میری اتنی بات تو رکھ لیجیے۔ چائے پی لیجیے۔''

''ایک شرط پر.... پیسے میں دوں گی۔'' وِدیوتّما کو وشوکر ما کی غیر ضروری چاپلوسی سے نفرت سی ہو رہی تھی۔

''ارے میڈم! بھلے دو تھپڑ مار لیجیے لیکن ایسا تو نہ کیجیے۔ آپ کے اور میرے پیسے کوئی الگ الگ ہیں کیا!''

''کیوں وشوکر ما! کیا اپنی تنخواہ میرے پاس ہی جمع کرا دیتے ہو؟ .... میں دفتر میں کسی اور کے پیسے کی چائے نہیں پیتی۔''

وِدیوتّما کی طنز سے بھرپور ہلکی ہنسی سن کر وِشوکر ما کا چہرہ اُتر سا گیا تھا۔ وِدیوتّما نے چائے کے پیسے دیے اور بائیں ہاتھ میں چائے کا کلھڑ تھام کر دائیں ہاتھ سے وِشوکر ما کا کاغذ دیکھنے لگی۔

''وِشوکر ما جی! آپ نے لکھا ہے کہ آپ نے روزانہ رات میں نو بجے تک رک کر کام کیا ہے جبکہ میرے سیکشن میں ایسا کوئی کام .... پھر اس کا مطلب یہ بھی ہوا کہ میں نے بھی اتنی دیر تک رُک کر آپ سے کام لیا ہے۔''

''ارے میڈم، کون رُکتا ہے! یہ تو محض دفتری خانہ پری ہے۔ آپ کو تو پتہ ہی ہے، میں نیا ہوں۔ بس اسی طرح مہینے میں ہزار بارہ سو روپے اوپر سے ہم لوگوں کو مل جاتے ہیں۔ اور کوئی اوپر کی کمائی تو ہے نہیں۔''

وِشوکر ما ہی ہی کر کے ہنس پڑا تھا۔ وِدیوتّما کے لیے اس طرح کا یہ پہلا واقعہ نہیں تھا۔ اس کے باوجود اس کے تیور میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس نے کچھ اور اُگلوانے کی نیت سے وشوکر ما سے پوچھا ''اچھا! اس کے پہلے والے اسٹیشن پر بھی ایسے ہی چلتا تھا کیا؟''

وِشوکر ما میڈم کی نادانی پر ہنس پڑا تھا۔

''میڈم کیا بھلا آپ جانتی نہیں ہیں؟ وہاں تو ایک میڈیکل ایجنٹ آفس کے لیے فکس تھا۔ مہینے کے آخر میں آتا تھا۔ سب کا سرٹیفکیٹ، بل، واؤچر بنوا کر دے جاتا تھا۔ کیش ہوتے ہی آکر سب سے اپنا بیس فی صد کمیشن لے جاتا۔ نہ اسپتال جانے کی جھنجھٹ، نہ بھاگ دوڑ کی ضرورت۔ آفس کا ہر آدمی، سال بھر میں کم از کم پندرہ بیس ہزار روپے تو میڈیکل بل سے بنا ہی لیتا تھا۔ میڈم، یہاں اگر کوئی ایجنٹ ہو تو اس سے ہماری جان پہچان کرا دیجیے۔ میں تو یہاں کسی کو جانتا نہیں ہوں۔''

وِشوکرما کے چہرے پر بے شرمی کی حریصانہ چمک اُبھر آئی تھی۔ وِدیوتما کو بھرشٹاچار کے نئے نئے طریقوں پر حیرت ہو رہی تھی۔ وہ تلملا اُٹھی۔

''جی نہیں، آج دس برسوں کی ملازمت میں سچ مچ بیمار ہونے پر بھی کبھی میں نے میڈیکل بل کلیم نہیں کیا۔ بھلا اس طرح کے لوگوں سے میری جان پہچان کیسے ہوگی۔''

وِدیوتما نے نفرت اور بے رخی سے وِشوکرما کی طرف دیکھتے ہوئے چائے کا خالی کلھڑ ڈسٹ بن میں ڈال دیا اور وِشوکرما کا کاغذ پڑھنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے سر اُٹھایا اور بولی، ''نہیں، وِشوکرما جی، اسے میں منظور نہیں کر سکتی۔ کل کو آڈٹ ہوگا تو یہ سوال ضرور اُٹھے گا کہ ایک ایک آدمی کو ہفتے میں مسلسل چھ دنوں تک چار چار گھنٹے کا اوورٹائم دیا گیا تو آخر اس کا آؤٹ پٹ کیا رہا؟ تب جواب دینا مشکل ہوگا۔ میں پھنس جاؤں گی۔'' وِدیوتما نے وِشوکرما کی طرف کاغذ کو سرکاتے ہوئے کہا۔

''ارے میڈم، آڈٹ والوں کو ہم لوگ ڈیل کر لیتے ہیں۔ بس آپ سائن کر دیجیے۔''

وِشوکرما نے اپنی ایک آنکھ یوں دبائی کہ جیسے اس نے وِدیوتما کو سارا سسٹم سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ لیکن وِدیوتما ٹس سے مس نہ ہوئی۔

''ارے میڈم، کیا آپ کو اپنے پرس سے دینا پڑ رہا ہے؟ سرکار کا پیسہ ہے۔ آپ کیوں فکر کرتی ہیں؟''

''بس، اب آپ چپ ہو جائیے۔ میں اپنا قلم پھنسانا نہیں چاہتی۔ اب آپ جا سکتے

ہیں۔''

وِدیوتّما کے دوٹوک جواب سے وِشوکرما کی دبی آواز تیز ہوگئی۔

''میڈم، یہ سارے اصول فلموں اور کتابوں میں اچھے لگتے ہیں۔ آپ بلا وجہ سسٹم سے اُلجھ رہی ہیں۔ آپ نہیں تو کوئی اور اس کام کو کردے گا۔'' وہ اپنا کاغذ سمیٹ کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا۔

''ٹھیک ہے بھائی، جاؤ۔ کروالینا کسی اور سے۔'' وِدیوتّما نے لاپرواہی سے کرسی سے پشت لگاتے ہوئے کہا۔

اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ پرانے آفس میں بھی اور یہاں بھی، سبھی لوگ اس کی اسی بات سے ناراض تھے۔ کلرک اور چپراسی اس بات سے ناراض رہتے کہ وہ ان کے او۔ ٹی۔ اے یا جھوٹے میڈیکل بل کو منظوری نہیں دیتی اور اعلیٰ افسران اس بات پر اُکھڑے رہتے کہ وہ گھوٹالوں اور کمیشن خوری میں ان کا ساتھ نہیں دیتی تھی۔ چائے پارٹیوں میں ان کے ساتھ بیٹھ کر گپیں مارنے کے بجائے وہ اپنے کمرے میں بیٹھی نہ جانے کیا کیا لکھتی رہتی تھی۔

جب کبھی اخبارات میں ان کے گھوٹالوں اور بدعنوانیوں کے بارے میں کچھ چھپتا تو انھیں وِدیوتّما پر ہی شک ہوتا۔..... شاید اسی نے راز فاش کیا ہو۔ شروع شروع میں تو وہ یہ سب سن کر بھنا جاتی تھی لیکن دھیرے دھیرے وہ ان سب کی عادی ہوتی چلی گئی۔ دھمکی بھرے گمنام خط، دوسروں کے نام سے لکھے گئے الزام تراشی والے خط، منترالیہ سے ایسے گمنام خطوں کی وضاحت طلبی، اعلیٰ افسران کے ذریعے ٹرانسفر یا سی۔ آر خراب کردینے کی بلاواسطہ دھمکی وغیرہ اس کے معمولات میں شامل ہوگئے تھے۔ جب کبھی افسردہ ہوجاتی تو پتاجی کی تصویر کے سامنے کھڑی ہوکر خاموشی کی زبان میں گفتگو کرتی۔

''آپ نے یہ کیسا سنسکار میرے خون میں بھر دیا ہے جو مجھے زمانے کے ساتھ چلنے نہیں دے رہا ہے؟ آخر کتنے دن میں اس آندھی میں اپنے پیر ٹکا پاؤں گی؟ اگر پاؤں اُکھڑ گئے تو؟''

اور اسے یوں محسوس ہوتا جیسے تصویر سے نکل کر پتاجی نے اس کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا ہو۔ اس میں ایک نئی توانائی بھر جاتی، ایک نیا جوش اور ولولہ۔ وِدیوتّما کے ملازم ہونے کے

چند دنوں بعد ہی پتا جی کی موت ہوگئی تھی۔ پتا جی بجلی کے محکمے میں اکاؤنٹینٹ تھے۔ ایمانداری کے صلے میں ان پر بے ضابطگی کا الزام عائد کر کے معطل کر دیا گیا تھا۔ مقدمہ جاری تھا لیکن بے عزتی کا صدمہ برداشت نہ کر پانے کی وجہ سے دل نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ خاندان میں کہرام مچ گیا۔ ماں تو کٹے ہوئے درخت کے مانند زمین بوس ہوگئی تھی۔ اس وقت چھوٹا بھائی ببلو گیارھویں جماعت میں اور بہن تلوتما ایم۔ اے فائنل میں تھی۔ پورے خاندان کا بوجھ وِدیوتما پر آن پڑا تھا۔ اس نے دوڑ بھاگ کر کے پتا جی کی گریجویٹی اور فنڈ وغیرہ کی رقم وصول کی اور اسے ماں کے نام فکسڈ ڈپازٹ میں رکھوا دیا اور اپنی تنخواہ سے پورے گھر کا خرچ چلانے لگی۔ خاندان کے تئیں اپنی ذمہ داریوں کے سبب ہی اس نے آج تک اپنے بیاہ کے بارے میں نہیں سوچا۔ ماں بھی مجبوری کی حالت میں، اس کی بوند بوند سوکھتی جوانی کو دیکھ کر بس رو کر رہ جاتی تھی۔ لیکن وِدیوتما کو تو جیسے اپنے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی نہیں تھی۔ کبھی ماں دبی آواز میں کہتی ''ارے ودیا، آج ہی کی نہیں، آگے کی بھی سوچ۔ ....کون ایک گلاس پانی دے گا تجھے؟'' تو وہ ہنس کر جواب دیتی ''پتی تو کسی کا بھی ہو، پانی دینے یا سیوا کرنے سے تو رہا۔ ہاں، بچوں سے اُمید کی جاسکتی ہے، تو کیا ببلو اور تیلو مجھے پانی نہیں دیں گے؟ ماں، تو فکر مت کر۔ ویسے تیری بات پر سوچوں گی، لیکن ابھی نہیں۔'

''کب سوچے گی؟ جب پچاس برس کی ہوجائے گی تب؟ ارے، تیرے پتا جی ہوتے تو اب تک کب کا.... میں کہاں جاؤں؟ کوئی بھائی بند...'' کہتے ہوئے ماں پھپھک کر رونے لگتی اور وِدیوتما ماں کو تسلی دے کر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ کیسے سمجھائے کہ اکیلی لڑکی کے آگے گھر اور باہر ہر جگہ مشکلیں گھات لگائے کھڑی رہتی ہیں۔ ایسے میں شادی کی بات سوچی بھی نہیں جاسکتی۔ پھر اپنے فائدے کے لیے خاندان کو آخر کس کے بھروسے پر چھوڑ دے؟ ایک بار ماں نے چپکے سے کسی دور کے ماما کے پچیرے سالے کے ساتھ بات چلائی بھی تھی۔ وہ وِدیوتما سے ملنے اس کے آفس میں آ پہنچا تھا۔ بات چیت کے دوران پتہ چلا کہ وہ انجینئر تھا اور دِلّی میں رہتا تھا۔

وِدیوتما نے عورت کی شرم کو بالائے طاق رکھ کر اس سے کھل کر بات کی۔ ''مسٹر دِواکر، آپ تو جانتے ہیں کہ میں یہاں سروس پر ہوں اور میرا خاندان ہے۔''

''پوسٹنگ کی چنتا مت کیجیے۔ میں دِلّی میں کروالوں گا۔'' دِواکر نے فوری جواب دیا تھا۔

''لیکن مسٹر دِواکر، آئی ہیوٹو لک آفٹر مائی فیملی۔ اگر آپ ایڈجسٹ کرسکیں تو.....''

''میں سوچ کر بتاؤں گا۔''

اور جو اس دن دِواکر گئے تو آج تک ان کی کوئی خبر نہیں آئی۔ اسی طرح کئی رشتے ٹوٹے۔ اس کی نوکری اور پروقار شخصیت کی وجہ سے کئی لوگوں نے شادی کے لیے 'ہاں' تو کردی لیکن خاندان کے ساتھ سمجھوتہ کرنے کو کوئی تیار نہیں ہوا۔ اب تو اس نے اپنے ساتھ ہی سمجھوتہ کرلیا تھا کیونکہ عمر سرکتے سرکتے چالیس کی دہلیز پر آچکی تھی اور اب رشتے آنے بھی تقریباً بند ہوگئے تھے۔ ببلو کمپٹیشن کی تیاری کررہا تھا۔ دو برس پہلے اس نے ایک اچھا لڑکا ڈھونڈ کر تلوتما کی شادی کردی تھی۔

اس کی آدھی ذمہ داری لگ بھگ ختم ہوچکی تھی۔ لیکن اس دن اسے زبردست دھکّا لگا تھا جب ببلو نے اسے مشکوک نگاہوں سے گھورتے ہوئے ماں کے سامنے مسز پرشانت کے ٹیلیفون کے بارے میں بتایا تھا۔ ''دیدی، آپ کو پرشانت کے ساتھ وہ رول کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ ان کی بیوی کو آپ کے ساتھ ان کا بیٹھنا بھی پسند نہیں ہے تو یہ سب کیوں کرتی ہیں؟ .....ٹیلیفون پر ہی وہ نہ جانے کیا کیا بک رہی تھی۔ اس کا لہجہ بہت خراب تھا۔ جی میں آیا کہ سامنے آجائے تو چار تھپڑ لگادوں۔''

وِدیوتما کو جواب نہیں سوجھ رہا تھا۔ کیا اب اسے ببلو کے سامنے اپنے کردار کی صفائی پیش کرنی پڑے گی؟ ماں کی مشکوک نگاہوں کو وہ کیسے سمجھائے کہ پرشانت محض اس کے آفس کا ایک ساتھی ہے اور کچھ نہیں۔ وہ ناٹک بھی اس کے محکمے کی جانب سے پیش کیا جانے والا ایک تجرباتی ڈرامہ تھا، زندگی کی سچائی نہیں تھی۔

وہ ایک ٹھنڈی سی سانس بھرتی ہوئی چپ چاپ وہاں سے اُٹھ کر اپنے کمرے میں چلی گئی

تھی۔ بستر پر سیدھے لیٹتے ہوئے وہ چھت کے پنکھے کی رفتار کو بے تعلقی سے دیکھنے لگی۔ آج آفس میں جو حادثہ پیش آیا تھا وہ اس کی آنکھوں کے سامنے کسی شرمناک منظر کی طرح پھرنے لگا تھا۔ اسٹیج پر محبت کا منظر پیش کیا جا رہا تھا۔ وِدیوتّما دَمینتی بنی ہوئی تھی اور پرشانت نل۔ اس کا ایک ہاتھ پرشانت کی دونوں ہتھیلیوں کے بیچ میں تھا اور وہ شرم سے اپنا چہرہ گھٹنوں پر جھکائے بیٹھی تھی۔ تالیوں کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ وہ منظر ختم ہوا تھا۔ اسٹیج پر پردہ گرتے ہی اس نے اپنا ہاتھ فوراً کھینچ لیا اور پرشانت کی طرف دیکھے بغیر ہی پیچھے گرین روم کی طرف تیز قدموں سے بڑھ گئی تھی۔ دوسرے ناٹکوں کے کلاکار بھی اپنے لباس تبدیل کرنے میں مصروف تھے۔ اس نے اپنے جوڑے میں بندھے ہوئے سفید پھولوں کے گجرے کو اُتار کر لمبی چوٹی کو ڈھیلا کر کے پیچھے جھٹک دیا اور گھٹنوں کے اوپر تک بندھی لال بارڈر والی پیلی ساڑی کو ٹھیک کرنے لگی۔ پرشانت بھی اپنے بدن سے شاہی لباس اُتار کر شرٹ پہن رہے تھے۔ کچھ کلاکار وِدیوتّما کو اچھی اداکاری کرنے پر مبارکباد دے رہے تھے۔ اسی دوران مسز پرشانت وہاں پہنچ گئیں۔ ان کی آنکھیں انگارے کی طرح دہک رہی تھیں اور غصّے کے مارے ان کے ہونٹ بھنچے ہوئے تھے۔ انھوں نے آتے ہی وِدیوتّما کو کندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا ''میرے پتی کے ساتھ اس طرح کا سین کرتے ہوئے تمھیں تو شرم نہیں آئی ہوگی لیکن وہاں بیٹھ کر مجھے آرہی تھی۔ ارے، اتنا ہی شوق ہے تو شادی کرلو، شادی۔ ....ناٹک کرنے سے پیٹ نہیں بھرے گا۔''

وِدیوتّما حیران سی کھڑی اس انجان عورت کا منہ دیکھ رہی تھی۔ ذِلت کے احساس کی وجہ سے اس کا گلا رندھ گیا تھا اور وہ عورت اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ اس کی بات سے اتنا تو پتہ چل ہی گیا تھا کہ وہ پرشانت کی بیوی تھی۔ چند لمحوں کے لیے تو پرشانت بھی ہکّا بکّا رہ گیا تھا لیکن وہ یکا یک اس پر برس پڑے ... ''انیتا! یہ کیا بدتمیزی ہے۔ تم وِدیوتّما کے بارے میں یہ کیسی اُلٹی سیدھی باتیں کر رہی ہو۔ ہوش میں تو ہو؟'' کہتے ہوئے پرشانت نے اسے کندھے سے پکڑ کر لگ بھگ ڈھکیلتے ہوئے دور کر دیا۔

انیتا تلملا کر اور زور سے بولنے لگی تھی۔ ''ہاں، ہاں، اب تو صاف ہو گیا۔ تمھارے ڈائرکٹر

صاحب نے ٹھیک ہی بتایا تھا۔ آفس میں تم دونوں ایک دوسرے کے ساتھ ....''

'چٹاخ!' بات پوری ہونے سے پہلے ہی پرشانت کا ایک زوردار طمانچہ انیتا کے گال پر پڑا تھا اور وہ حیرانی سے پرشانت کی طرف پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔

''سوری وِدیوتما، میری وجہ سے تمھاری بے عزّتی ہوئی۔ میں اُس کمینے عبد اللہ کو نہیں چھوڑوں گا۔ اتنی نیچ حرکت! ڈائرکٹر کی کرسی کے لائق نہیں ہے۔ پلیز، وِدیوتما، فارگیٹ اِٹ، چلو، میں تمھیں گھر چھوڑ آؤں۔ تم ڈسٹرب ہوگئی ہو۔''

''نہیں، پرشانت جی، میں چلی جاؤں گی۔ آپ اپنی مسز کو سنبھالیے۔''

وِدیوتما کا گلا بھر آیا تھا۔ اس نے نفرت بھری ایک نگاہ انیتا پر ڈالی اور سر جھکائے باہر نکل گئی۔ اس کے بعد آفس میں ڈائرکٹر صاحب کے ساتھ اس کے تعلقات سدھر نہیں سکے۔ وہ اسے کسی طرح جھکانا چاہ رہے تھے اور وہ ان کے آگے جھکنے کو تیار نہیں تھی۔ تھک ہار کر آخر اس نے کوشش کر کے اپنا تبادلہ اس آفس میں کروالیا۔ کبھی کبھی پرشانت اس سے ملنے یہاں بھی آتے تھے لیکن اس کا سلوک ان کے ساتھ بھی ویسا ہی خشک ہوتا جیسا اس آفس کے لوگوں کے ساتھ۔ وہ جان بوجھ کر خشک رویہ اختیار کرتی جارہی تھی تا کہ پھر کوئی دوسری انیتا اسے سب کے سامنے ذلیل نہ کر سکے۔ بہت ہوگا تو یہی نا کہ لوگ کہیں گے کہ وہ ایک خشک مزاج عورت ہے .....اسے یہ سننا منظور تھا۔

''ہیلو مس! اکیلے بیٹھے بیٹھے کیا سوچ رہی ہو؟ کوئی رومانی گیت یا ناول کا پلاٹ؟'' وِدیوتما کے آفس کی ایک ساتھی اپرنا چہکتی ہوئی آ کر اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''ناول، افسانہ میں لکھتی نہیں، اس لیے پلاٹ میں دماغ اُلجھتا نہیں۔ نظم کے لیے ماحول چاہیے، سو دیکھ رہی ہو۔'' وِدیوتما نے بے چارگی سے ہنستے ہوئے اپنی صفائی دی۔

''لیکن اس وقت تو ایک لمبی کہانی کا پلاٹ تیرے ہی ارد گرد گھوم رہا ہے۔ لکھ ڈال پھٹا پھٹ۔ مجھے یقین ہے وہ کہانی ایوارڈ ضرور حاصل کرے گی۔'' اپرنا نے بے فکری کی ہنسی کے ساتھ اپنی بائیں آنکھ دبا دی تھی۔ یہ اس کی عادت تھی۔ وہ جب بھی خوش ہوتی، اپنی بائیں آنکھ دبا

دیتی۔ وِدیوتّما بھی ایک ہلکی ہنسی کے ساتھ اس کی طرف دیکھنے لگی۔ اپرنا بولے جارہی تھی ''لکھو کہ میں ایک ایماندار لڑکی بدنام ہوگئی۔ میں باس کو کمیشن نہیں دے پائی، اس لیے سیکشن کے سارے کام جو میرے ذمے تھے ہٹا دیے گئے۔ جب اتنے پر بھی جی نہیں بھرا تو باس نے کسی سے جھوٹا خط لکھوا کر مجھ پر الزام لگوایا اور مجھے بدعنوان قرار دے دیا گیا اور میں اس کے مکڑی کے جال میں پھنسی بے چاری.....''

''چھٹپٹاتی ایک مکھی۔'' اس کا جملہ مکمل کرکے وِدیوتّما بھی ہنس پڑی تھی۔

اپرنا نے سمجھانے والے انداز میں کہنا شروع کیا ''دیکھ وِدیوتّما، جب پورے کنویں ہی میں بھنگ پڑی ہے تو تو اکیلے اسے کیسے صاف کر پائے گی! ایک چپراسی کو پانچ روپے کی چائے لانے کو کہو تو وہ تین ہی چائے میں پانچ بنا دیتا ہے۔ دو چائے کے پیسے رکھ لیتا ہے۔ اس ملک کے وزیروں اور لیڈروں پر گھوٹالوں کے مقدمے چل رہے ہیں۔ جیل جاتے ہیں، باہر آتے ہیں، پھر وہی سفید کھادی کا کرتا پاجامہ اور 'کھادی لباس نہیں، خیال ہے' کا نعرہ لگاتے ہیں۔ ایسے حالات میں تو راجا ہریش چندر کی نواسی بنی ہوئی ہے.....تو ایسے ہی چھٹپٹائے گی اور اوپر سے بدنام بھی ہوگی۔''

''لیکن اپرنا، تو ہی بتا کہ اتنا پڑھ لکھ لینے کے باوجود آج بھی کہیں جاتے وقت اگر کوئی چھینک دیتا ہے۔ یا بلی راستہ کاٹ جاتی ہے تو کیوں ہمارا دل وسوسوں سے گھر جاتا ہے؟ بچپن میں ملے سنسکار اور ماحول کا اثر ہماری رگوں میں دوڑتے خون میں گھل کر اس طرح بہتا ہے کہ بعد میں اعلیٰ تعلیم بھی اسے متاثر نہیں کرپاتی۔ جو سنسکار میرے خون میں شامل نہیں ہے اسے بھلا میں ان بے ایمانوں کی وجہ سے کیوں اختیار کرلوں؟''

وِدیوتّما، اپرنا کے سامنے ایک طرح سے اپنی صفائی پیش کررہی تھی۔ اس آفس میں اپرنا اس کی اچھی سہیلی بن گئی تھی۔ اسی لیے وہ اکثر اپنی اُلجھن اس سے بیان کردیا کرتی تھی۔ اس آفس میں بھی اسے اپنے ایماندارانہ اور روُکھے طرزِ عمل کی وجہ سے سبھی کے عتاب کا شکار بننا پڑا تھا۔ بار بار اسے بلاواسطہ دھمکیاں دی جاتیں... 'میڈم، آپ مکھیہ دھارا سے الگ ہوکر چل رہی ہیں۔ اس میں سوائے نقصان کے کوئی فائدہ نہیں ہے۔'

ڈاکٹر نیرجا مادھو - ایک نظر میں

شوہر کا نام : ڈاکٹر بنی مادھو

تاریخ ولادت : ۱۵/ مارچ ۱۹۶۲ء

جائے پیدائش : گاؤں-کوتوال پور (سریمئو)، پوسٹ-مفتی گنج، ضلع جونپور، اُترپردیش

مستقل پتہ : مدھوبن، ۱۴/۵۹۸، سارنگ ناتھ کالونی، سارناتھ-۲۲۱۰۰۷
وارانسی، اُترپردیش۔ فون: ۲۵۹۵۳۴۴-۰۵۴۲؛ موبائل: ۹۷۹۲۴۱۱۴۵۱

پیشہ : پروگرام (پرسار بھارتی)
بھارت کے مختلف ریڈیو اور ٹی وی اسٹیشنوں پر کام کرنے کا تجربہ

تعلیمی استعداد : ایم اے (انگریزی)؛ بی ایڈ؛ پی ایچ ڈی؛ ڈپلوما اِن میوزک (ستار)

مطبوعات

(الف) افسانوی مجموعے:

(۱) چِنگے آکاش کا سورج (۱۹۹۷ء)

(۲) ابھی ٹھہرو اندھی صدی (۱۹۹۸ء)

(۳) آدِم گندھ تتھا انیہ کہانیاں (۲۰۰۲ء)

(۴) پتھ دِنش (۲۰۰۳ء)

(۵) چپ چِنتارا، رونا نہیں (۲۰۰۷ء)

(۶) وایا پانڈے پور چوراہا (زیرِ طبع)

(ب) ناول:

(۱) یم دیپ (۲۰۰۲ء) - ہجڑوں کی زندگی پر لکھا گیا ہندی کا پہلا ناول۔

(۲) تیبھیا سودھا (۲۰۰۴ء) - آزادی کے بعد پاکستان سے ہجرت کرنے والے ان لاکھوں افراد کی کہانی جو راجوری کی گھاٹیوں میں پناہ گزیں تھے۔ قبائلی بھیس میں حملہ آوروں نے انھیں موت کے گھاٹ اُتار دیا تھا۔ دھن دولت لوٹنے کے ساتھ ساتھ بچیوں اور عورتوں پر ڈھائے گئے مظالم کی داستان۔

(۳) گیشے جمپا (۲۰۰۶ء) - بھارت میں پناہ گزیں تبتیوں کی تحریکِ آزادی اور ان کے اپنے معاشرے اور اپنی مذہبی و تہذیبی تشخص کے تحفظ کے لیے کی جانے والی کوششوں کو موضوع بنایا گیا ہے۔

(۴) ایہا مرگ رے من (۲۰۰۹ء) - امن کی تلاش میں بھٹکتا ہوا انسان مذہب کی پناہ میں آتا ہے تو دیکھتا ہے کہ مذہب ایک طرف تو امن کے راستے کی جانب رہنمائی کر رہا ہے اور دوسری طرف سماجی

ڈائرکٹر صاحب کا دایاں ہاتھ لیکن اپنے دائیں ہاتھ سے معذور جائسوال بابو نے ایک دن اس سے کہا تو اس نے بھی طنز سے پوچھا تھا ''یہ مکھیہ دھارا کیا ہے، جائسوال صاحب؟ پہلے تو یہ نکتہ واضح کیجیے۔ اور دوسری بات، میں نقصان کی پرواہ نہیں کرتی۔ ٹرانسفر یا سی۔ آر میں خراب ریمارکس کے ڈر سے میں بے ایمانی اور بدعنوانی تو ہرگز نہیں کروں گی۔ ایک بات تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ عورتوں کا ذہنی استحصال یا ایذا رسانی ایک جرم ہے۔ سپریم کورٹ نے بھی ....''

وِدیوتّما نے بھی ایک بلا واسطہ دھمکی جائسوال کی معرفت ڈائرکٹر کو بھجوا دی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ جب سے اس نے دس ہزار کی قیمت والے صوفے کو پینتالیس ہزار میں خریدنے والی تجویز اور بِل پر اعتراض کیا تھا نیز پانڈے جنرل مرچنٹس کو چالیس فی صد کمیشن دے کر اپنا کوٹیشن پاس کروانے کے راز کو فاش کیا تھا تب سے اس معاملے سے متعلق کلرک سے لے کر ڈائرکٹر تک کھلبلی مچ گئی تھی۔ اس کے بعد ہی اس کے خلاف کمیشن مانگنے کا الزام لگانے والا ایک لمبا چوڑا شکایت نامہ آفس میں آیا تھا اور اس سے کوئی وضاحت طلب کیے بغیر اس کے خلاف کارروائی کرتے ہوئے اسے دِلّی بھیج دیا گیا تھا۔ وہ پریشان تو تھی لیکن مطمئن بھی تھی۔ سانچ کو آنچ کیا! پھر یہ کہ یہاں سبھی ایک آواز میں بولتے ہیں تو کیا وہاں بھی ان ہی کی آواز ہوگی؟ کوئی تو اس کا ہم نوا ہوگا۔

''کیا ہوا اس جانچ کمیشن کا جو دِلّی سے آیا تھا؟'' اپرنا نے اس سے پوچھا۔

وِدیوتّما کے چہرے پر ایک ہنسی تیر گئی .... بھدی ہنسی۔

''کیا ہونا تھا! سارے ڈاکیومینٹس میں نے سامنے رکھ دیے تھے لیکن سرسری نگاہ سے دیکھنے کے بعد بولا کہ میڈم آپ تو جانتی ہی ہیں کہ آج کل اوپر کے افسروں کو ناخوش کرکے نوکری نہیں ہوسکتی۔ کچھ انتظام کرلیجیے۔ میں وہاں دِلّی میں صاحب سے کہہ کر معاملہ رفع دفع کروادوں گا۔ آپ تو جانتی ہی ہیں کہ سرکاری بجٹ کے ایک روپے کا ہیر پھیر بھی سنگین جرم سمجھا جاتا ہے۔''

''پھر، تو نے کیا سوچا، وِدیوتّما؟'' اپرنا پریشان ہو اُٹھی۔

وِدیوتّما مسکرا رہی تھی .... ''سوچنا کیا ہے!''

''دیکھ، زمانہ ہی جب اسی کا ہے تو تو کیوں بہاؤ کے مخالف چل کر اپنا اور اپنے خاندان کا نقصان کر رہی ہے؟ لے دے کر فائل بند کروا دے۔''

وِدیوتّما زور سے ہنس پڑی تھی۔

اپرنا حیرت سے پوچھ رہی تھی ''تو کیا سوچا؟ کچھ تو بتاؤ۔''

''سوچ رہی ہوں، اس کہانی کو لکھ ہی ڈالوں، بھلے نوکری خطرے میں پڑ جائے۔''

''مذاق مت کر، میں سیریئس ہوں۔''

''تجھے ہنسانے کے لیے اس وقت مجھے ایک بہت اچھا چٹکلا یاد آ رہا ہے جو میری موجودہ حالت کے عین مطابق ہے۔ ایک بار کا ذکر ہے سب کتّے بھاگ رہے تھے۔ ان ہی کے ساتھ ایک اونٹ بھی بھاگا جا رہا تھا۔ ایک آدمی نے روک کر پوچھا 'ارے بھائی اونٹ، تم کتوں کے ساتھ کیوں بھاگ رہے ہو؟''

اونٹ نے جواب دیا ''میونسپلٹی والے کتوں کو پکڑنے کی تحریک چلا رہے ہیں۔''

''....لیکن تم تو اونٹ ہو، پھر....؟''

''یہ تم کہہ رہے ہو نا بھائی۔ اگر پولس والوں نے مجھے پکڑ لیا تو بیس سال لگ جائیں گے یہ ثابت کرنے میں کہ میں کتا نہیں، اونٹ ہوں۔''

وِدیوتّما اور اپرنا قہقہہ مار کر ہنس پڑی تھیں۔

کچھ دیر بعد اپرنا نے دوبارہ پوچھا ''اچھا، اب سنجیدگی سے بتا کہ کیا سوچ رہی ہو؟''

''سوچتی ہوں کہ کہیں سے وہ کالیداس ہی آ جائے اور کتوں کی اس بھیڑ میں مجھے دیکھ کر چلا پڑے 'اونٹ، اونٹ'۔ میں اُس کالیداس کے چرنوں میں جھک جاؤں گی۔ بس .....کم سے کم میرا اصل چہرہ تو واضح ہو جائے۔'' بے چارگی کے سبب وِدیوتّما کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔

اپرنا ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بس اتنا ہی کہہ پائی تھی ''ضدی ہے تو۔''

* * *

(مطبوعہ: ماہنامہ 'شاعر'، فروری ۲۰۰۵ء)

بھنوری

آج جیل میں شیام لال کا پہلا دن تھا۔ دن کیا صرف رات ہی رات تھی۔ چاروں طرف تاریکی۔ جس کوٹھری میں اسے رکھا گیا تھا اس میں لوہے کی سلاخوں والا صرف ایک دروازہ اور کوٹھری کے بالکل اوپر ایک چھوٹا سا روشندان تھا۔ دن میں کبھی کبھی اس روشندان سے مٹھی بھر دھوپ آجاتی تھی جس سے دن کا احساس ہوتا تھا۔ دروازہ کھلتا بھی تھا تو دوسرے کمرے میں۔ اس لیے وہاں روشنی آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ 'شاید شام ہوگئی ہے' سوچتے ہوئے شیام لال نے خالی خالی نگاہوں سے روشندان کی طرف دیکھا۔ قتل کرنے کی کوشش کے جرم میں اسے دی گئی دس برس کی قید بامشقت کی سزا میں سے ابھی تو چند گھنٹے ہی گزرے تھے۔ اس سیلن بھری تاریک کوٹھری میں کیا وہ ایک برس بھی زندہ رہ پائے گا؟ شیام لال اندر سے تڑپ اُٹھا۔ اس کی روح اپنی بیوی اور بچوں کے لیے کراہ اُٹھی۔

نہ جانے گھر والوں کا کیا حال ہوا ہوگا؟ بیوی تو بے حال سی بستر پر پڑی ہوگی۔ یوں بھی سوچ سوچ کر وہ تو پہلے ہی آدھی ہوچکی تھی۔ گھر میں چولھا تو آج جلا ہی نہ ہوگا۔ اگر گھر کا سربراہ اور وہ بھی کمانے والا شخص ہی سزا کاٹنے پر مجبور ہوجائے تو گھر میں کسی میّت کے سوگ کا عالم ہونا فطری ہے۔ شیام لال بے بس سا کوٹھری کے ایک کونے میں زمین پر بیٹھ گیا۔

بیرونی کوٹھری میں کوئی چہل قدمی کر رہا تھا لیکن اب اسے کسی سے کوئی سروکار نہیں تھا۔

اس نے جج کے سامنے اپنا جرم قبول کرلیا تھا۔ اسے سزا ملی تھی جسے بھگتنے کے لیے وہ تیار تھا۔ اس کے وکیل نے بار بار زور دے کر کہا کہ وہ جج کو واضح طور پر بتا دے کہ جرم کا اصل سبب کیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ حالات کے پیش نظر اور اس کی موجودہ ذہنی حالت کو دیکھتے ہوئے اس کی سزا کچھ کم کردی جائے لیکن شیام لال نے صاف انکار کردیا۔ اسے بھلے ہی لمبی مدت کی سزا ہوجائے لیکن وہ سارے حالات سب کے سامنے بار بار دوہرانا نہیں چاہتا تھا۔

شیام لال نے لیٹنے کے لیے زمین پر اپنا گمچھا بچھا دیا۔ لیٹتے ہی پیٹھ میں ناہموار زمین چبھنے لگی۔ اس نے کروٹ بدلی لیکن دل کی بے قراری کم نہ ہوئی۔ گھبرا کر وہ اُٹھ بیٹھا۔ روشندان سے صرف دو تارے ٹمٹماتے ہوئے دِکھائی دے رہے تھے۔ اسے محسوس ہوا کہ وہ بھنوری کی دو معصوم آنکھیں ہیں جو اپنے باپو کی تڑپ اور بے چینی کو مجبوری سے دیکھ رہی ہیں۔

"میری بچی ....." کہہ کر شیام لال ہتھیلیوں میں چہرہ چھپا کر سسک اُٹھا۔ "میں دوہری سزا بھگت رہا ہوں، میری بچی۔ جسمانی سزا تو معمولی ہے لیکن میری روح مجھے جو سزا دے رہی ہے وہ شاید دوزخ سے بھی بھیانک ہے۔" بدبداتے ہوئے شیام لال نے دوبارہ روشندان کی طرف دیکھا۔ بھنوری کی دو ٹمٹماتی آنکھیں اسے پُرنم محسوس ہوئیں۔ ان دو تاروں کے ارد گرد بھنوری کا بچپن اور نوجوانی کا زمانہ سمٹ آیا تھا۔

گوری چٹی ننھی بھنوری۔ جب پیدا ہوئی تھی تو شیام لال پُرسکون تھا لیکن وِدیا پہلے بیٹے کے بعد ایک بیٹی اور پھر اس کے بعد بھی بیٹی پا کر کچھ اُداس سی تھی۔ اس بار وہ اپنے بیٹے بھانوٗ کا جوڑا لگانا چاہتی تھی اور اس کا نام بھرمر رکھنے کا ارادہ تھا۔ لیکن بیٹی کی پیدائش سے اس کا دل مرجھا گیا تھا۔ شیام لال نے ہنستے ہوئے گھر آئی ہوئی لکشمی کا سواگت کرنے کی صلاح دی اور کہا، "بھرمر نہیں آئے تو کیا، بھنوری آ گئی۔"

بھرمر کے انتظار میں جب بھنوریوں کی تعداد پانچ ہوگئی تو مایوس ہوکر شیام لال اور ودیا نے قسمت کے آگے سر جھکا دیا اور پانچ بیٹیوں اور ایک بیٹے کی پرورش کرنے میں مصروف ہوگئے۔

شیام لال گاؤں ہی کے پرائمری اسکول میں ٹیچر تھے۔ بزرگوں نے ترکے میں مکان اور تھوڑی سی زمین چھوڑی تھی جس سے کسی طرح پورے خاندان کا خرچ چل جاتا تھا۔ اگر کسی مہینے میں کوئی فرد بیمار پڑ جاتا تو دوسری مدوں کے اخراجات میں کٹوتی کر کے ہی اس کا علاج کروانا ممکن ہوتا۔ خاندان کی بھاری بھرکم گاڑی کھینچنے کی وجہ سے شیام لال کے چہرے اور بالوں پر بڑھاپے نے وقت سے پہلے ہی قبضہ جما لیا تھا لیکن ہمیشہ مسکراتے رہنے والے شیام لال کے اندر کے دکھ کو کسی نے نہیں سمجھا تھا۔ ان کے دکھوں کا اصل سبب ان کی بیٹی بھنوری تھی۔

شروع شروع میں تو کچھ پتہ نہ چلا لیکن جب بھنوری ایک سال کی ہوئی تو انھوں نے محسوس کیا کہ وہ عام بچوں سے الگ ہے۔ اس میں نہ تو بچوں کی سی شوخی تھی اور نہ ہی ان جیسے معمولات۔ بس خاموشی کے ساتھ ایک جگہ بیٹھی رہتی۔ 'دھیرے دھیرے ٹھیک ہو جائے گی' کہہ کر وہ وِدیا کو تسلی دیتے لیکن بھنوری کو دیکھ دیکھ کر وہ خود فکرمند ہو جاتے تھے۔ ڈاکٹر کو دِکھایا تو ان کا شک درست نکلا۔ بھنوری دماغی کمزوری کی شکار تھی۔ اس کے لیے بھنوری کو ایک لمبے عرصے تک مینٹل ہاسپٹل میں رکھ کر اس کی تربیت کرنے کی ضرورت تھی۔

شیام لال نے بڑی مجبوری کے ساتھ اپنا جائزہ لیا۔ بڑا بیٹا بھانو ایک اچھے اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ شیام لال کی ساری اُمیدیں اسی سے بندھی ہوئی تھیں۔ اس لیے وہ اس کی تعلیم میں کوئی کسر باقی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ زندگی کے آخری دن بیٹے کے ساتھ اچھی طرح گزار پانے کی اُمید میں وہ اپنی تنخواہ کا ایک بڑا حصہ بھانو کی فیس، کتابوں، بیاضوں اور ٹیوشن پر صرف کر دیتے تھے۔

بھانو جب پڑھنے بیٹھتا تو ماں اس کے پاس بیٹھ کر پیار سے دیکھا کرتی۔ نہ جانے کب اسے بھوک لگ جائے یا کوئی اور ضرورت ہو۔ بڑی بیٹی پنکی رسوئی میں گھسی اپنے ناتجربہ کار ہاتھوں سے چائے ناشتہ تیار کر کے وقفے وقفے سے بھیا کو دیتی رہتی۔ بھانو کے مستقبل کو روشن بنانے کے چکر میں لڑکیوں کا مستقبل اندھیروں کی نذر ہوتا جا رہا تھا۔ بھنوری کی غیر فطری حرکتوں کو دیکھ کر شیام لال اور ودیا پریشان ہو جاتے تھے لیکن کوئی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ کوئی مستقل علاج ہوتا

تو شیام لال قرض لے کر بھی اسے پورا کرتے لیکن مینٹل ہاسپٹل میں بھرتی کرانے کے خیال ہی سے شیام لال اور ودیا کانپ اُٹھتے تھے۔

سماج میں اپنی بدنامی کے ڈر سے کچھ برسوں تک وہ بھنوری کے پاگل پن کو کمزوری اور دماغی ترقی کی سست رفتار کہہ کر چھپاتے رہے لیکن دھیرے دھیرے گاؤں اور آس پاس کے لوگوں کو بھی پتہ چل گیا۔ ہمیشہ اپنے ہاتھوں میں دو چھوٹے چھوٹے ڈنڈے لیے بھنوری کبھی بھینس کے سامنے کھڑی ہو کر خوب زور زور سے ہنستی تو کبھی پیڑ سے باتیں کرتی۔

اس دن شیام لال دروازے کے باہر گاؤں کے کچھ لوگوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کر رہے تھے۔ گاؤں کے مکھیا بابو رام چارپائی کے ایک کونے پر اکڑوں بیٹھے کچھ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے، تبھی نہ جانے کہاں سے بھنوری آئی اور بابو رام کو پیچھے سے دھکا دے دیا۔ غیر متوقع دھکے سے وہ اپنے آپ کو سنبھال نہ پائے اور دھڑام سے زمین پر گر پڑے۔ غصّے اور کھسیاہٹ میں انھوں نے کہا تھا ''سچ مچ یہ پاگل ہے کیا؟''

شیام لال شرم سے پانی پانی ہوگئے۔ وہ بھنوری کو گھسیٹتے ہوئے اندر لے گئے اور دو تھپڑ مارتے ہوئے کمرے میں بند کر دیا۔ کچھ دیر تک اندر سے دروازہ زور زور سے پیٹنے کی آواز آتی رہی لیکن شیام لال نے جی کڑا کر کے بھنوری کو سدھارنے کی کوشش کی۔ دو تین گھنٹوں کے بعد جب شیام لال نے دروازہ کھولا تو بھنوری زمین پر لیٹی ہوئی چھت کی طرف دیکھ کر ہنس رہی تھی۔ شیام لال نے دُکھی ہو کر اسے اُٹھایا اور خود ہی اس کے ہاتھ پیر دھوئے۔ کھانا کھلاتے وقت بھنوری کے گال پر تھپڑ کے نشان دیکھ کر ودیا سسک اُٹھی اور شیام لال سر جھکائے باہر جا کر بیٹھ گئے۔

دھیرے دھیرے وقت گزرتا گیا۔ بھنوری کی پاگل پن والی حرکتوں میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اب وہ تیرہ برس کی ہو چکی تھی۔ وِدیا حتی الامکان کوشش کرتی کہ بھنوری گھر کے اندر ہی رہے لیکن وہ جب تب باہر نکل جاتی۔ کبھی کھیتوں میں کھڑی ادھ پکی فصل میں بیلوں اور بھینسوں کو چھوڑ آتی تو کبھی پڑوس کے کسی گھر میں جا کر چپ چاپ کھڑی ہو جاتی۔ لوگ کچھ دیر تک اس کی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے لطف اندوز ہوتے اور پھر اسے گھر تک پہنچا جاتے۔ شیام لال گونگے کی طرح سب

کچھ دیکھا کرتے۔ کبھی کبھی بھنوری کو اس کی حرکتوں کی سزا دیتے لیکن اس کا کوئی مستقل حل نہ نکلتا۔ ادھر بھانو کے بی۔ ایس۔ سی میں فیل ہوجانے سے شیام لال کی رہی سہی اُمیدیں بھی خاک میں مل گئیں۔ بھانو کو ڈاکٹر بنانے کا خواب چکنا چور ہوگیا۔ باپ کی خواہش کے خلاف بھانو نے ایک پرائیویٹ فیکٹری میں نوکری کر لی۔ شیام لال نے بیٹے کی مجبوری کو محسوس کیا اور اسے بھی اپنی قسمت مان لیا تھا۔ اپنے فنڈ سے کچھ پیشگی رقم نکال کر اور تھوڑی زمین بیچ کر شیام لال نے بڑی بیٹی کی شادی کردی تو بھانو نے اپنے مستقبل کے تعلق سے فکرمندی کا اظہار کیا۔ ودیا بیٹے پر بپھر اُٹھی، ''کیا چاہتے ہو؟ ہڈیاں بیچ کر تمھارے باپو پیسے لائیں؟ جو ہے اسی میں سے توڑ جوڑ کرنا پڑے گا۔''

لیکن شیام لال کو بیٹے کی پریشانی فطری معلوم ہوئی۔ آخر ابھی چار لڑکیاں باقی ہیں۔ مانا کہ بھنوری کی شادی نہیں ہوسکے گی لیکن تین لڑکیوں کی شادی میں تو ایسا لگتا ہے کہ پوری زمین ہی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ پھر بھانو کا اپنا پریوار کیا کرے گا؟

شیام لال نے اضافی آمدنی کے لیے شام کو چار ٹیوشن پڑھانے شروع کردیے۔ رات دیر گئے تھکے ہارے لوٹتے تو بیلوں اور بھینسوں کو ناند سے الگ کرتے۔ صبح کے لیے ان کا چارہ تیار کرتے۔ دوسرے دن اسکول پہن کر جانے کے لیے اپنی اکلوتی دھوتی اور کرتے کو پانی میں ڈالتے۔ تب تک ودیا کھانا تیار کرکے پروس دیتی۔ بڑی بیٹی کا بیاہ ہوجانے کے بعد گھر کے اندر اور باہر کی ذمہ داری کے ساتھ ہی رسوئی کا کام بھی ودیا کو ہی کرنا پڑتا تھا۔ تینوں لڑکیاں ابھی چھوٹی تھیں۔

ایک دن شیام لال لوٹ کر آئے تو ودیا رسوئی میں مصروف تھی۔ تینوں لڑکیاں اندر والی کوٹھری میں پوال پر پڑے ہوئے بستر پر دھما چوکڑی مچائے ہوئے تھیں۔ بھانو ابھی تک فیکٹری سے نہیں لوٹا تھا۔ اسے بھی سائیکل سے آنے جانے میں کافی دیر ہوجاتی تھی۔ بھنوری کہیں نظر نہیں آئی۔ ودیا سے پوچھنے پر اس نے بھی لاعلمی کا اظہار کیا تو شیام لال بھڑک اُٹھے ——

''گھر میں رہ کر اتنا دھیان بھی نہیں رکھ پاتی ہو؟ بھنوری کو کوئی کام کاج سکھانا تو دور کی

بات ہے، وہ کہاں ہے اس کا پتہ بھی نہیں۔ لڑکی بڑی ہو رہی ہے، دماغ کم ہے، اس کا خیال ہے کہ نہیں؟'' کہتے ہوئے شیام لال بھنوری کو پڑوس میں ڈھونڈنے چلے گئے۔ پریشان سی ودیا، شوہر کی پھٹکار سن کر رو پڑی۔ توے پر رکھی ہوئی روٹی جلنے لگی تو وہ چونکی۔ تبھی شیام لال، بھنوری کا کان پکڑے لگ بھگ گھسیٹتے ہوئے اندر آئے لیکن اُن کے غصّے سے لاعلم بھنوری لگاتار ہنسے جارہی تھی۔ اپنے دونوں ہاتھوں میں لیے ہوئے ڈنڈے کو وہ زور زور سے ایک دوسرے پر مار رہی تھی اور ہنسے جارہی تھی۔ شیام لال نے غصّے میں آ کر اس کے دونوں ڈنڈے چھین کر چولھے میں ڈال دیے۔ بھنوری رونے لگی اور روتے روتے جلتے ہوئے ڈنڈوں کو چولھے میں سے کھینچ لیا۔ آگ کی کچھ چنگاریاں اُڑ کر ودیا کے اوپر گر پڑیں۔ نائیلون کی ساڑی پل بھر میں کئی جگہ سے جل کر سکڑ گئی۔ شیام لال نے لپک کر اپنے دونوں ہاتھوں سے اسے مسل دیا۔ چنگاری بجھ گئی لیکن شیام لال کا غصہ بھڑک اُٹھا۔ انھوں نے بھنوری کو نہ جانے کتنے تھپڑ جڑ دیے۔ روتے روتے بھنوری سو گئی۔ اس دن شیام لال کھانا نہ کھا سکے۔ ودیا اس کے سر پر تیل رکھنے گئی تو شیام لال کسی بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ ودیا بھی سسک پڑی۔

''نہ جانے کن پاپوں کی سزا بھگوان نے ہمیں بھنوری کی شکل میں دی ہے۔'' کہتے ہوئے شیام لال نے ودیا کی گود میں اپنا منہ چھپا لیا۔ ودیا نے قریب ہی سوئی ہوئی بھنوری کو محبت سے دیکھا۔ اس کے گالوں پر سوکھے ہوئے آنسوؤں کا نشان چراغ کی مدھم روشنی میں چمک رہا تھا۔

ودیا اب بھنوری کو لے کر زیادہ فکرمند رہنے لگی تھی۔ بھنوری کی نگرانی ہی میں اس کا سارا وقت گزرتا کیونکہ دماغ کو چھوڑ کر بقیہ سارے اعضا معمول کی طرح نشو ونما پا رہے تھے۔ ودیا نے کئی بار کوشش کی کہ اسے دوپٹہ اوڑھنے کی عادت پڑ جائے لیکن وہ اُٹھا کر پھینک دیتی۔ تھک ہار کر ودیا نے اس کے فراک کے سامنے کے حصے میں بڑی بڑی جھالریں لگا دی تھیں۔ گھر کی کچھ ذمہ داریاں کم کرنے کے لیے شیام لال نے بھانو کا بیاہ کر دیا لیکن اُس دن کام سکھانے کے نام پر بھنوری کو بہو کا پیٹی کوٹ دھوتے ہوئے دیکھ کر شیام لال کا من تڑپ اُٹھا تھا۔ وہ کچھ بول نہیں سکے۔ اپنے اور ودیا کے نہ رہنے پر بھنوری کا جو مستقبل ہوگا وہ شیام لال کی آنکھوں کے سامنے

آ گیا تھا۔

ایک دن ٹیوشن پڑھا کر شیام لال لوٹے تو ودیا اُداس سی گھر کے باہر ہی بیٹھی ہوئی مل گئی۔ شیام لال نے اداسی کا سبب پوچھا تو اس نے بتایا کہ آج بھنوری نے بہو کے میکے سے ملے ہوئے قد آدم آئینے پر اپنا ڈنڈا پٹک دیا تھا۔ شیشہ چٹخ گیا۔ بہو نے بھانو کے آتے ہی رو رو کر بھنوری کا کارنامہ بتا دیا تو بھانو نے بھنوری کو اسی ڈنڈے سے اتنا مارا کہ اس کی آنکھ کے نیچے ورم آ گیا۔ یہ سب بتاتے ہوئے ودیا سسک اُٹھی تھی۔ شیام لال چپ چاپ اندر چلا گیا۔

اندر جا کر اس نے سہمی ہوئی بھنوری کو اپنی گود میں بٹھا لیا۔ بھنوری باپ کا پیٹ اپنے ہاتھوں سے چھوتے ہوئے ہنس پڑی تھی۔ شیام لال نے دیکھا کہ بھنوری کی آنکھ کے نیچے نیلا نشان پڑ گیا تھا۔ ودیا نے ہلدی پیاز کا جو لیپ لگایا تھا، بھنوری نے اسے نوچ کر پھینک دیا تھا۔ اب اس جگہ صرف پیلا پن نظر آ رہا تھا۔ یکا یک شیام لال کو محسوس ہوا کہ بھنوری کا فراک گیلا ہے۔ اسے پیار سے سہلاتے ہوئے انھوں نے اسے کھڑا کیا۔

''بیٹا، فراک کیسے گیلا ہو گیا؟'' کہتے ہوئے شیام لال نے اس کے فراک کو پیچھے سے دیکھا۔ شرم کے بوجھ سے ان کا سر جھک گیا۔ بھنوری کا کپڑا لال لال ہو رہا تھا۔ اس نے ودیا کو بلایا اور بھنوری کا کپڑا بدلنے کے لیے کہا اور غصّے سے باہر نکل کر بھانو کو پکارا۔ بھانو اپنے کمرے سے باہر آیا تو شیام لال نے بپھر کر کہا، ''بھنوری پاگل ضرور ہے لیکن جانور نہیں۔ کیا سمجھ کر تم نے اسے اتنا مارا؟''

''اگر اسے اس طرح ڈرا کر طور طریقے نہیں سکھائیں گے تو کل وہ ہمارا ہی سر درد بنے گی۔ آپ لوگوں کی زندگی تو بیت جائے گی لیکن ہم لوگوں کے لیے آپ جو یہ سوغات چھوڑ جائیں گے اسے تو ہمیں ہی بھگتنا پڑے گا نا۔'' بھانو کے اس دوٹوک جواب سے شیام لال دُکھی ہو گئے۔ اپنا سر پکڑ کر وہ وہیں زمین پر بیٹھ گئے۔ بھانو بھی غصّے میں بھرا ہوا اندر چلا گیا۔

☆

شیام لال نے کروٹ بدلی۔ اب اس کی ناک جیل کی کوٹھری کی بدبو کی عادی ہوگئی تھی۔ روشندان سے وہ دونوں تارے اب بھی اسے ٹمٹماتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ اس نے اپنے دونوں پیر پھیلا لیے تھے۔ چاروں طرف ایک عجیب سے منحوسیت چھائی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''منحوس؟ ہاں، اس دن سے زیادہ منحوس تو آج کا دن ہو ہی نہیں سکتا۔'' بدبداتے ہوئے شیام لال کو وہ منحوس دن یاد آ گیا۔ اس کے دل میں نفرت کا ایک سیلاب اُمڈ آیا تھا اور اس نے اندھیرے ہی میں ایک طرف پچ سے تھوک دیا۔

''آج مجھے کوئی ایک گھنٹے کے لیے بھی اس قید سے آزاد کردے تو میں اس بدمعاش کو موت کی نیند سلا آؤں۔'' شیام لال بڑبڑایا۔ اس کے چہرے پر سختی اُبھر آئی اور جبڑے بھنچ گئے۔ اس نے غصّے میں اپنی مٹھی زمین پر پٹکی۔

کتنا منحوس دن تھا وہ! اس دن طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے وہ اسکول جانے کی بجائے گھر کی چھت پر ہی دھوپ میں لیٹا تھا۔ گھر میں سب لوگ اپنے اپنے کام میں مصروف تھے۔ اسی وقت ودیا گھبرائی ہوئی، ہانپتی کانپتی آئی تھی اور روتے ہوئے کہا ——

''سن رہے ہیں بھانو کے باپو؟ دیکھیے نا، بھنوری کیا کہہ رہی ہے؟''

شیام لال نے بھنوری کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے پر کھرونچ کے کئی نشان تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ شیام لال کے پوچھنے سے پہلے ہی بھنوری نے اپنا فراک اوپر اُٹھا کر ہنستے ہوئے بتانا شروع کیا —— ''باپو، بتّو چاچا ایسے پکڑے تھے... ایسے کر رہے تھے۔'' شیام لال کو لگا جیسے آسمان اس کے سر پر ٹوٹ پڑا ہو۔ انھوں نے کانپتی ہوئی آواز میں ودیا سے پوچھا ——

''کیا بھنوری بتّو کے گھر گئی تھی؟''

ودیا نے روتے ہوئے اقرار میں سر ہلا دیا تھا۔ شیام لال کا دماغ گھوم گیا۔ بتّو، گاؤں کا سب سے آوارہ اور بدقماش آدمی تھا۔ وہ ادھیڑ عمر کا تھا۔ اس کی بدکرداری کی وجہ سے ہی اب تک اس کا بیاہ نہیں ہوسکا تھا۔ اس کی بوڑھی ماں بھی اپنے بھائیوں کے پاس چلی گئی تھی۔

بھنوری اشاروں میں اپنے ساتھ کی گئی غلط حرکتوں کو اپنی ماں کو بتانے میں مصروف تھی۔

وسیاسی اتھل پتھل کا سبب بھی بنتا ہے۔ لوگ اپنے اپنے فائدے کے لیے اپنے اپنے ڈھنگ سے دھرم کا استعمال کرتے ہیں۔ مذہب کے اسی دوہرے کردار کا حل ڈھونڈتا ہوا ناول۔

(۵) اوڑن مہیلا کانسٹبل کی ڈائری (۲۰۰۹ء) - ایک عبادت گاہ کی حفاظت کے لیے متعین خاتون کانسٹبل کے مشاہدات اور ماضی و حال کو سمجھنے کی اس کی کوشش اس ناول کا موضوع ہے۔

(۶) انوپمیہ شنکر (۲۰۰۹ء)

(۷) دھنیہ وادسیونی (۲۰۱۰ء)

(ج) شعری مجموعے :

(۱) پرستھان ترئی (۲۰۰۰ء)

(۲) زہرا پھوا (زیرِطبع)

(د) دیگر تصانیف :

(۱) ریڈیو کا کلا پکش (۲۰۰۶ء)

(۲) چیت چت، من مہوا (۲۰۰۸ء)

(۳) یہ رام کون ہیں؟ (زیرِطبع)

(ہ) ترجے :

(۱) ناول 'یم دیپ' کا اڑیہ زبان میں ترجمہ

(۲) چند کہانیوں کا اُردو اور بلغاریائی زبانوں میں ترجمہ

(۳) ناول 'گیشے جمپا' کا انگریزی اور تبّتی زبانوں میں ترجمہ (زیرِطبع)

اعزازات :

(۱) سرجنا پرسکار - اترپردیش ہندی سنستھان (لکھنؤ) نے ۱۹۹۷ء میں 'چنکے آ کاش کا سورج' کو انعام سے نوازا۔

(۲) یشپال پرسکار - اترپردیش ہندی سنستھان (لکھنؤ) نے ۱۹۹۸ء میں 'ابھی ٹھہرو اندھی صدی' کو انعام سے نوازا۔

(۳) بھارتیندو پربھا - بھارتیندو اکادمی (وارانسی) کے ذریعے ادبی خدمات کے لیے۔

(۴) پہرو آسمان - شمبھوناتھ سنگھ ریسرچ فاؤنڈیشن (وارانسی) کے ذریعے مجموعی ادبی خدمات کے لیے۔

(۵) یووا پرتیبھا سمان - اکھل بھارتیہ وِدوَت پریشد (وارانسی) کے ذریعے۔

(۶) 'ریجنل جرنلسٹ ایسوسی ایشن کی طرف سے 'کاشی رتن'۔

(۷) ناول 'گیشے جمپا' کے لیے مدھیہ پردیش ساہتیہ اکادمی نے ۲۰۰۶ء میں ایوارڈ عطا کیا۔

(۸) ناول 'انوپمیہ شنکر' کے لیے شنکر اچاریہ پرسکار (کولکتہ - ۲۰۰۹ء)۔

(۹) مدھیہ پردیش راج بھاشا پرچار سمیتی کے ذریعے 'شیلیش مٹیانی راشٹریہ کتھا پرسکار' ۲۰۰۹ء۔

شیام لال تیزی سے نیچے اُترے اور بنّو کے گھر کی طرف چل پڑے۔ بنّو کے دروازے پر تالا لٹک رہا تھا۔ سامنے والے گھر میں پوچھا تو پتہ چلا کہ کچھ دیر پہلے ہی بنّو کہیں گیا ہے۔ شیام لال چپ چاپ لوٹ آئے۔ اپنی سائیکل اُٹھائی اور بازار کی طرف نکل گئے۔

لوٹ کر آئے تو گھر میں ماتم سا چھایا تھا۔ ودیا کا رو رو کر برا حال تھا۔ بھنوری اپنی بہنوں کے ساتھ کھیلنے میں مست تھی۔ باپ کو دیکھتے ہی وہ کھلکھلا کر ہنسی اور دوبارہ بنّو چاچا والا واقعہ بتانے لگی۔

''چپ.....'' شیام لال دہاڑے۔

ڈرنے کی بجائے بھنوری ہنس پڑی تھی۔ ودیا نے سہم کر شیام لال سے کہا ''کیا ہمیں بنّو کے خلاف تھانے میں رپورٹ لکھوانی چاہیے؟''

''خاموش۔ اب اس پل کے بعد اس واقعے کے تعلق سے منہ بھی مت کھولنا۔ میرے سامنے بھی نہیں۔'' شیام لال جیسے پاگل سے ہو گئے تھے۔

''ایک گلاس پانی لاؤ۔'' شیام لال نے ودیا سے کہا۔ ودیا نے پانی لا کر رکھ دیا۔

''بھنوری کے بال کتنے اُلجھے ہیں۔ جاؤ تیل لے آؤ۔ میں اس کے سر پر تیل رکھوں گا۔ تم لوگوں سے کچھ نہیں ہو سکتا۔'' کہتے ہوئے شیام لال نے بھنوری کو بلا کر اپنی گود میں بٹھا لیا۔

ودیا تیل لے کر آئی تو شیام لال گلاس کا پانی بھنوری کو پلا رہے تھے۔ پانی پلانے کے بعد انھوں نے بھنوری کو بڑے پیار سے لٹا دیا اور اس کے سر میں تیل ڈال کر دھیرے دھیرے اس کے بالوں کو سہلانے لگے۔ بھنوری کی آنکھوں میں نیند بھرنے لگی تھی۔ باپ کا محبت بھرا لمس پا کر وہ سو گئی۔ شیام لال نے اس کے چہرے کو دھیان سے دیکھا اور اس کے سر پر اپنا سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ وہ پاگلوں کی طرح بھنوری کا چہرہ اور ہتھیلیاں چوم رہے تھے۔ باپ کے رونے کی آواز سن کر بھانو بھی اپنے کمرے سے نکل آیا۔ شیام لال نے پاگلوں کی طرح ہنستے ہوئے بھانو سے کہا ''لو، تمھارا سر درد میں نے ختم کر دیا۔'' اور وہ بھنوری کو لپٹا کر بلک اُٹھے۔ ودیا نے دھیان سے بھنوری کو دیکھا اور دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ بھانو کے چہرے پر گھبراہٹ اور

شرمندگی کے جذبات ایک ساتھ اُبھر آئے اور وہ بھنوری کو اپنے دونوں ہاتھوں میں اُٹھا کر تیزی سے پیدل ہی ڈاکٹر کے پاس لے کر بھاگا۔

سوچتے سوچتے شیام لال بے قرار ہوکر اُٹھ بیٹھے اور جیل کی کوٹھری میں ہی ٹہلنے لگے۔ بھنوری کا بے جان ہوتا ہوا چہرہ ان کے دل کو مسل رہا تھا۔ جب جج نے اپنی ہی بیٹی کو قتل کرنے کی کوشش کے جرم میں انھیں دس برس کی قید کی سزا سنائی تو اخباری نمائندوں نے انھیں گھیر لیا۔ دبلے پتلے اور کمزور سے آدمی کا اتنا سنگین جرم کرگزرنا سب کے لیے تجسّس اور حیرت کا باعث بنا ہوا تھا۔ کسی نمائندے نے ان سے پوچھا، ''شیام لال جی، آپ نے اپنی ہی بیٹی کو قتل کرنے کی کوشش کس وجہ سے کی؟''

شیام لال بے حس و حرکت اس نمائندے کا منہ دیکھتے رہے۔ کوئی جواب نہ ملنے پر دوسرے نمائندے نے سوال کیا ——

''شیام لال جی، آپ کو اپنے جرم کی سزا تو معلوم ہی رہی ہوگی، پھر بھی آپ نے ایسا کیوں کیا؟''

شیام لال نے مختصر سا جواب دیا، ''اپنی بیٹی کی زندگی بھر کی سزا ختم کرنے کے لیے۔'' یہ کہتے ہوئے شیام لال خلا میں دیکھتے ہوئے آگے بڑھ گئے تھے۔

* * *

اکیلے چنے کی آزاد لَے

‘‘کسی پل کی ڈھلان پر چڑھنا جتنا مشکل ہوتا ہے، اترنا اتنا ہی آسان ہوتا ہے۔ چڑھتے وقت ہمیں اپنی اندرونی طاقت استعمال کرنی پڑتی ہے۔ خود کو پیچھے کی طرف لڑھکنے سے بچانے کے لیے ہر قدم کو دھرتی کے سینے پر مضبوطی سے جما کر رکھنا پڑتا ہے اور جسم کو اونچائی کی جانب زبردستی جھکا کر چلنا ہوتا ہے۔ پیروں کے نیچے زمین ہو، سامنے بلند مقصد ہو تبھی چڑھنے کے بارے میں سوچ سکتے ہیں لیکن ڈھلان سے اُترنے کے لیے کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑتی۔ بس من کو ڈھیلا چھوڑ دیجیے، تن اپنے آپ بندش سے آزاد ہو جاتا ہے اور پاؤں سرپٹ دوڑنے لگتے ہیں۔ ڈھلان کے ختم ہونے اور ہموار زمین کے آنے کے بعد بھی آدمی تھوڑی دور تک دوڑتا چلا جاتا ہے۔ سائنس کی زبان میں اسے جمود کا قانون کہتے ہیں جبکہ روحانیت کی اصطلاح میں یہی قسمت ہے یعنی پچھلے جنموں کے کرموں کا پھل انسان اگلی زندگی تک بھگتتا ہے۔ اس پل کی ڈھلان سے بھی لوگ جمود کے اسی قانون کے مطابق چلے جا رہے ہیں۔ دو پہیہ اور تین پہیہ گاڑیوں کے ڈرائیوروں نے گاڑی کو نیوٹرل میں چھوڑ دیا ہے۔’’ دل میں پیدا ہونے والے ان خیالات کے ساتھ ہی بھاویش نے بھی اپنی کار کی اسٹیئرنگ کو لاپرواہی سے سنبھالتے ہوئے ایکسیلریٹر سے پیر ہٹا لیا۔ گاڑی پانی کی طرح ڈھلان پر پھسلنے لگی۔

نہ جانے گاڑی جمود کے قانون کے تحت چل رہی تھی یا حرکت کے لیکن ڈھلواں سڑک پر پیدل چلتے ہوئے لوگ اسی قانون کے تحت دھیمی رفتار سے دوڑ رہے تھے .... ایک دوسرے کے وجود سے بے خبر۔ سائیکل پر سوار یہ بوڑھا آدمی یقیناً جمود کے قانون کی بجائے قسمت کے سبب اس بھیڑ میں شامل ہے۔ ورنہ عمر کے اس مرحلے پر اسے اپنے گھر میں آرام سے بیٹھنا چاہیے تھا۔ سفید دھوتی کرتے کی مانند سر اور مونچھوں کے بال قبل از وقت ہی سفید نہیں ہو گئے ہیں۔ اس کا

ثبوت چہرے کی جھریاں ہیں۔ گاڑی میں لگے ہوئے سائڈ گلاس سے بھاویش کب سے اس بوڑھے کو دیکھ رہا تھا جو ڈگمگاتے ہینڈل کو سنبھالتے ہوئے دائیں بائیں کسی بھی جانب نکلنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن بھیڑ تھی کہ موقع ہی نہیں دے رہی تھی۔ کبھی کوئی نوجوان سائیکل والا یا موٹر سائیکل والا اس کی بغل سے زنّاٹے سے نکل جاتا تو بوڑھے کے ہاتھ ہینڈل پر کپکپا کر رہ جاتے۔ عمر کے ساتھ ساتھ اس مرحلے پر خود اعتمادی بھی دھوکا دے جاتی ہے۔ آنکھیں اور کان تو اکثر ہی بے وفائی کر جاتے ہیں۔

اس کے گاؤں کے رمن بابا اسی وجہ سے حادثے کا شکار ہو گئے تھے۔ کان سے اونچا سنتے تھے اور آنکھوں میں موتیا بند تھا۔ پوتوں اور نواسوں کو چندا ماما کی کہانی سناتے تو کہتے —— ''مجھے آجکل آٹھ آٹھ چاند دِکھائی دیتے ہیں۔'' لوگ سن کر ہنس دیتے۔ بڑھاپے میں سٹھیا گئے ہیں۔ لوگوں کو ایک نہیں سوجھتا، انھیں آٹھ آٹھ دکھائی دیتے ہیں۔ اور جب حادثے کے بعد زخمی حالت میں انھیں اسپتال میں بھرتی کیا گیا تو پتہ چلا کہ آنکھوں میں موتیا بند تھا جس کی وجہ سے سامنے سے آنے والی اسکوٹر کی بتی انھیں آٹھ آٹھ دِکھائی دے رہی تھی۔ سائیکل پر بازار سے لوٹتے وقت وہ اسکوٹر سے ٹکرا گئے تھے اور ان کے کولھے کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔ کافی علاج معالجے کے بعد بھی جڑ نہ سکی اور بستر پر پڑے پڑے ہی زندگی کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔

اس بوڑھے بابا کو راستہ دے ہی دوں۔ بیچارے کب سے کوشش کر رہے ہیں۔ گھر میں کوئی لائق بیٹا ہوتا تو کیوں اس عمر میں سائیکل پر سفر کرنا پڑتا۔ یہ سوچ کر بھاویش نے ایکسیلریٹر سے پیر ہٹا لیا اور کار کی رفتار کم کرتے ہوئے بریک کو ہلکا سا دبا دیا۔ بوڑھے نے ایک ہاتھ سے دھوتی سنبھالتے ہوئے گاڑی کے سامنے سے دائیں جانب والی سڑک پر سائیکل موڑ دی۔ اسی وقت پیچھے سے تیز رفتاری سے آتے ہوئے ٹیمپو والے نے بچاتے بچاتے بھی سائیکل کو ٹکر ماردی۔ بوڑھا لڑکھڑا کر سڑک پر گر پڑا۔ ٹیمپو کی رفتار اور تیز ہو گئی۔ بھاویش نے گاڑی کی رفتار دھیمی رکھتے ہوئے دیکھا کہ بوڑھا اُٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کے سر سے خون کی ایک پتلی دھار بہہ رہی تھی یعنی چوٹ جان لیوا نہیں تھی۔ دونوں جانب سے گاڑیاں حسبِ معمول گزر رہی تھیں۔

بھاویش کی گاڑی کے پیچھے ہارن کا مسلسل شور اسے راستہ دینے کا اشارہ کر رہا تھا۔ بھاویش نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ سامنے ٹیمپو والا رفتار کو اور بڑھاتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ شاید اس نے دیکھا نہیں تھا کہ بوڑھے کو زیادہ چوٹ نہیں لگی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ بھیڑ میں پکڑ لیا گیا تو بہت مار پڑے گی۔ اکثر سنا جاتا ہے کہ حادثے کے بعد ڈرائیور سب سے پہلے گاڑی چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے، گاڑی کا نقصان ہو تو ہو وہ تو مالک کی ہے لیکن اس کی اپنی جان تو سلامت رہے۔ ورنہ حادثے کے بعد پکڑے جانے پر ڈرائیور کو تو لوگ مار مار کر ادھ مرا کر ڈالتے ہیں اور پتھر مار مار کے دوسری گاڑیوں کو بھی نقصان پہنچاتے ہیں۔ یہ سب کرنے کے لیے شہد کی مکھیوں کی طرح نہ جانے کہاں سے بھیڑ اُمڈ آتی ہے۔ ویسے بھی یہ بھیڑ بیشتر اَن پڑھ اور بیروزگار لوگوں کی ہوتی ہے جو صبح گھر سے نکلتے ہیں تو سڑکوں، چوراہوں، چائے پان کی دکانوں پر دنیا جہان کے موضوعات پر بے سروپا بحث کرتے، کلھڑ میں چائے کی چسکیاں لیتے اور دائیں بائیں پان تمباکو کی پیک تھوکتے، بیڑی سگریٹ کا دھواں اُڑاتے وقت گزارتے ہیں اور رات ہوتے ہوتے لوٹ کر اپنے گھروں میں دبک کر سو جاتے ہیں۔ لیکن اس طبقے کے لوگوں کی مردانگی بھی موقع اور حادثہ کی نوعیت دیکھنے کے بعد ہی جاگتی ہے۔ حادثے میں زخمی آدمی کے لیے جہاں ان کے جذبات فوراً مشتعل ہو جاتے ہیں اور ہاتھ آ جانے پر ڈرائیور کو روئی کی طرح دُھننے کے لیے ان کے بازوؤں کی مچھلیاں پھڑک اُٹھتی ہیں وہیں اگر کوئی غنڈہ بدمعاش کسی کی جان لینے کی کوشش کرتا ہے تو دھڑا دھڑ دکانیں بند اور یہ ساری شہد کی مکھیاں دکانوں کے اندر ہو جاتی ہیں۔

یہ سب سوچتے ہوئے بھاویش نے اپنی کار کی رفتار تیز کر دی۔ بغل میں بیٹھی ہوئی بیوی کی آنکھوں میں تیرتا ہوا خاموش سوال ''کیا تم بھی ....؟'' اس کی مردانگی کو للکار رہا تھا۔ اس ٹیمپو والے کو پکڑنا ہی چاہیے۔ دو چار جھانپڑ ہی سہی، آئندہ کے لیے سدھر جائے گا۔ پھر کسی کو ٹکر مار کر بھاگ جانے کی ہمت نہیں کرے گا۔ اس بوڑھے کی جگہ میرے پتا جی یا کوئی اور رشتے دار ہو سکتا تھا۔ تب بھی کیا وہ چپ رہ جاتا؟ رفتار پر ذرا سا کنٹرول رکھا جائے تو کتنے ہی حادثوں کو ٹالا جا سکتا ہے لیکن یہاں تو سب لوگ اس طرح چلتے ہیں جیسے وزیر اعظم کے قافلے کے ساتھ ہوں۔ کئی بار

سننے میں آیا ہے کہ فلاں وزیر کے قافلے کی کار سے فلاں داروغہ کچل گیا یا صفائی ورکر کی موت ہوگئی لیکن موت تو کسی نہ کسی بہانے سے آتی ہی ہے سواُن کی کار کی کیا غلطی؟ ابھی چند روز پہلے کا واقعہ ہے نائب صدر جمہوریہ کی آمد پر ایک عورت نے ڈی۔ ایم اور ایس۔ پی سے التجا کی کہ اسے نائب صدر سے ملنے کی اجازت دی جائے۔ دس برس قبل سرکٹ ہاؤس میں ڈیوٹی کرتے وقت ایک وزیر کی کار سے حادثے کا شکار ہونے والے اس کے شوہر کے معاوضے کی رقم آج تک نہیں ملی تھی۔ نائب صدر سے فریاد کرنا چاہتی تھی لیکن انتظامیہ نے اسے ملنے نہیں دیا۔ اخبار والوں نے شور مچایا لیکن مقامی اخبار بڑے بڑے لیڈروں کے کس کام کے؟ کیوں پڑھیں گے اسے؟ خاص خاص سیاسی خبریں تو کسی بھی اخبار کے پہلے صفحے پر چھپی ہوتی ہیں۔ اندر کے صفحات کی خبریں تو معمولی لوگوں کے بارے میں ہوا کرتی ہیں —— فلاں تاجر کو ہفتہ وصولی کے چکر میں گولی ماردی گئی .... پروفیسر کے اغوا شدہ بیٹے کا گلا کاٹ کر قتل .... پانچ بچوں کی ماں اپنے پریمی کے ساتھ فرار .... نابالغ لڑکی کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر کے آدمی نے بدفعلی کرنے کی کوشش کی .... وغیرہ وغیرہ۔ یہ خبریں عام لوگوں میں خوف کا جذبہ پیدا کرنے اور ہر پل اپنے دائرے میں سمٹے رہنے اور ایک دوسرے کو شک کی نظر سے دیکھتے رہنے کے لیے ہوتی ہیں۔ صبح صبح چائے کے گھونٹ کے ساتھ اس طرح کی خبروں کا ناشتہ ہر سامنے والے کو ٹیکس وصولنے والا غنڈہ، قاتل، اغوا کرنے والا یا مافیا ڈان جیسا بنا دیتا ہے۔ اپنے باپ کے ساتھ جاتا ہوا بچہ بھی اغوا کیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ان خبروں کی اہمیت الیکشن کے جلسوں وغیرہ کے وقت بڑھ جاتی ہے۔ بقیہ اوقات میں تو عوام کا دکھ عوام کے لیے، عوام کے ذریعے ہوتا ہے۔

بھاویش کی کار اور ٹیمپو والے کے درمیان میں دو تین موٹر سائیکل والے آگئے تھے۔ وہ چاہیں تو اپنی موٹر سائیکل آزو بازو سے نکال کر ٹیمپو والے کو روک سکتے ہیں۔ اس بوڑھے کو ٹکر مار کے بھاگنے کی سزا دے سکتے ہیں لیکن ان کی رفتار اور حرکات دیکھ کر ایسا نہیں لگتا کہ اس حادثے کا ان پر ذرا بھی اثر ہوا ہے۔ جبکہ وہ بھی بوڑھے کو ٹکر لگنے کے وقت آس پاس ہی رہے ہوں گے۔ انسان کی انسانیت ختم ہوتی جارہی ہے۔ احساس مردہ ہو چکا ہے۔ کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو جائے،

کوئی کچھ نہیں بولتا۔ ایک دن ایک کوّا بجلی کے تار سے چھو جانے کی وجہ سے مر گیا۔ نہ جانے کہاں سے بہت سارے کوّے دیکھتے ہی دیکھتے کائیں کائیں کرتے ہوئے جٹ گئے تھے۔ انسان تو کوّے سے بھی بدتر ہوتا جارہا ہے۔ چیونٹیوں کو بھی اپنے زخمی یا مرے ہوئے ساتھی کو اجتماعی روپ سے ڈھو کر کہیں لے جاتے ہوئے دیکھا ہے۔

بھاویش نے دوبارہ بیوی کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کے تاثرات سے پتہ چلتا تھا کہ وہ بھی چاہتی ہے کہ ٹیمپو والے کو پکڑ کر اس کی غلطی کی سزا دی جائے۔ ویسے عام طور پر وہ دوسروں سے بلا وجہ دشمنی لینے کے حق میں نہیں ہے۔ کہیں مار پیٹ کا واقعہ دیکھتے ہی وہ اسے جلدی سے وہاں سے ہٹ جانے کے لیے کہتی ہے۔ کبھی کبھی تو ذرا سی دیر ہوتے ہی اس سے جھگڑنے لگتی ہے۔ اس کا سوچنا بھی صحیح ہے۔ کیا پتہ کب یہیں پر کٹہ، بندوق نکل آئے؟ آج کل بھلا کون کس سے کمزور ہے؟ جسمانی طاقت کی تو ضرورت ہی نہیں ہے اب۔ پیچھے سے وار کرنا کسی بھی مچھر پہلوان یا شیر سنگھ کے لیے آسان ہے۔ کبھی کبھی تو سڑک پر گزرتے ہوئے اگر سامنے کوئی ایسی گاڑی دِکھائی دے جائے جس میں بیٹھے ہوئے کسی خاص الخاص آدمی کے پرائیویٹ محافظ بندوقوں کا منہ پیچھے سڑک کی طرف تانے، چوکنے سے دِکھائی دیتے ہیں تو وہ گھبرا کے جھٹ سے کہہ دیتی ہیں —— ''اپنی گاڑی دھیمی کرلو۔ اسے گزر جانے دو۔ پتہ نہیں کیوں اس طرح کے لوگوں کے آگے پیچھے چلنے میں ڈر لگتا ہے۔ کب ان کا کوئی دشمن گھات میں ہو اور ان پر حملہ کردے یا اس میں بیٹھے ہوئے لوگوں کو ہی کسی پر غصہ آجائے۔ سبب کوئی معمولی سی بات بھی ہوسکتی ہے۔ جیسے راستہ نہ دینا یا راستہ دینے کے لیے بار بار ہارن بجانا یا کچھ اور۔ ہاتھوں میں آتشی اسلحہ اور آنکھوں میں بھی آگ۔ بہت ڈر لگتا ہے ایسے لوگوں سے۔''

بھاویش اپنی بیوی کی بزدلی پر مسکرا اُٹھتا۔ عورت کے خوف سے مرد کے اندر کی مردانگی کو تسکین ہوتی ہے۔ فتح مندانہ لہجے میں کہتا —— ''ان سے کیا ڈرنا جو خود ہی ڈرے ہوئے ہیں۔ اپنی حفاظت کے لیے اتنے لوگوں کا لاؤ لشکر لے کر جو چل رہے ہیں ان سے کیا ڈرنا؟'' بیوی کا سیدھا سا جواب اس کی مردانگی کو ٹھنڈا کر جاتا —— ''ان سے کوئی اُلجھنا تو نہیں چاہے گا نا؟ یہ

ابھی سڑک پر کوئی غلط حرکت ہی کیوں نہ کردیں لیکن کوئی انھیں پکڑنے کی جرأت نہیں کرے گا۔"

لیکن اس وقت اس ٹیمپو والے کو تو وہ بھی سزا دلانا چاہتی ہے۔ اس کی آنکھوں سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے پکڑ کر اس کے کیے کی سزا دی جائے۔ ہر معاملے میں لوگ اگر اسی طرح چپ رہیں گے تو لاقانونیت بڑھتی جائے گی۔ یہ خیال آتے ہی بھاویش کے پیر ایکسیلریٹر پر دباؤ ڈالنے لگے۔ آج اگر ہم کسی کی طرف سے نہیں بولیں گے تو کل ہمارے ساتھ کچھ غلط ہو جانے پر کوئی دوسرا بھی کچھ نہیں بولے گا۔ اور پھر یہ تو اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ بھلے ہی اور لوگ محسوس نہ کریں لیکن مجھے محسوس کرنا اور کروانا ہے۔ کچھ لوگوں کی آتما تو ان کو جھنجھوڑے گی۔ اس ٹیمپو میں بیٹھی ہوئی سواریاں کتنی پتھر دل ہیں۔ ٹکر مار کر ڈرائیور بھاگتا جا رہا ہے اور ان لوگوں نے کچھ نہیں کہا۔ سواریاں چاہتیں تو ٹیمپو والے کو فوراً روک کر اسے ڈانٹ پلاتیں۔ اس بوڑھے آدمی کے علاج کے لیے اسی ٹیمپو پر لاد کر لے جاتے لیکن لوگوں کے جذبات مردہ ہو چکے ہیں یا پھر آگے آ کر کون جھنجھٹ مول لے۔ لوگ اس ڈر سے بھی آنکھ کان بند کر لیتے ہیں —— پولس کا لفڑا، ڈاکٹر کے سوال۔ اب کس کے پاس اتنی فرصت ہے؟ ٹیمپو والا کمزور ہے تو اس کے بارے میں سب سوچا جا سکتا ہے لیکن کیا کسی غنڈے یا بدمعاش کے تعلق سے یہ ساری باتیں سوچی جا سکتی تھیں! کہیں پڑھا تھا —— ارجن نے کرشن بھگوان سے پوچھا تھا —— "آپ بھی کمزور کو ہی کیوں ستاتے ہیں؟" جواب میں بھگوان نے ارجن کو سامنے بنے ہوئے دو کنوؤں میں سے کسی ایک کی اینٹ اُکھاڑ کر لانے کا حکم دیا۔ اینٹیں لانے پر بھگوان نے پوچھا تھا —— "تم اسی کنویں کی اینٹ کیوں لے آئے ارجن؟" "بھگوان! وہ کنواں پرانا اور ٹوٹا پھوٹا تھا اس لیے۔ میں نے سوچا مضبوط کنویں کو کیوں اُجاڑوں!"

یہ سب سوچتے ہوئے بھاویش مسکرا اُٹھا۔ ٹیمپو والا آگے کے چوراہے سے کسی طرف مڑ کے اوجھل ہو گیا تھا۔ بھاویش نے بیوی کی طرف ایک خاموش نگاہ ڈالی۔ دونوں کی نگاہیں ملیں اور دونوں ہی کی نگاہوں میں نظر انداز کر دینے کا جذبہ تھا۔ جیسے چاہتے تو تھے لیکن ممکن نہ ہوا۔ یوں بھی اکیلا چنا کیا بھاڑ جھونکے گا؟

* * *

حاکم

''گور کی پتر کی رے، مارے کریجوا میں ....''

جھلنگی چارپائی پر لیٹ کر آسمان کی جانب منہ کیے حاکم گا رہا تھا۔ شام کا سورج ڈھلنے کو تھا۔ قریب ہی زمین پر اس کی بیوی کوشلیا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ رات کے کھانے کے لیے چاول چن رہی تھی۔ شوہر کو اپنی ہی دھن میں گاتا ہوا دیکھ کر اس نے پوچھا،

''کیا آج اُدھرَے سے چڑھا کے آئے ہو؟''

''ارے ناہیں مور گور کی پتر کی، ہم تو ....'' اس نے چارپائی پر پڑے پڑے ہی کوشلیا کی جانب کروٹ لے کر اپنا چہرہ فلمی انداز میں اس کے کندھے پر لگا دیا۔

''ہٹو اس عمر میں مسخری سوجھ رہی ہے۔'' اس نے بناوٹی شرم سے کہا۔

''ابھی تو میں جوان ہوں ....ابھی تو میں ....'' اس نے دوسرا گانا شروع کر دیا۔

''دور سے ہی باس آ رہی ہے اور تم گانا گا گا کے بات ٹال رہے ہو۔'' کوشلیا نے چاول میں رینگتے ہوئے ڈھولے (کیڑے) کو چٹکی میں پکڑ کر ایک طرف پھینکتے ہوئے اسے ترچھی نگاہ سے دیکھا۔

''توُری نجریا کٹار، او رانی میری....'' وہ دوبارہ الاپنے لگا۔ اس کی زبان لڑکھڑا رہی تھی۔

''اچھا، اچھا، رہنے دو۔ آج تمھاری دال نہیں گلے گی۔''

''کیوں؟'' اس کے منہ سے شراب کے بھبکے کے ساتھ کچھ پان اور تمباکو کی پیک کے چھینٹے بھی اُڑے تھے۔

''آج گُدری بُو آ گئی ہے۔ بھیتر وہ رہے گی اس لیے تمھاری دال نہیں گلنے والی۔''

''ارے تو ہم ترکاری بھات سے کام چلا لوں گا رانی۔'' وہ پھر بہکنے لگا۔

''کاہے اتنی پیّت ہو کی دِماگے نہ کام کرے؟'' اس نے المونیم کے تھال میں چاول پھٹکتے ہوئے کہا۔

''تم کو دیکھ کر تو بڑے بڑوں کا دماگ چل جائے۔''

''چار لڑِکا کی مائی پر کیا کسی کا دماگ چلے گا؟'' وہ ہنس پڑی۔ پان اور تمباکو سے دانت کالے پڑ گئے تھے جو ہونٹوں کے درمیان سے دِکھائی دینے لگے تھے۔

''مان لو آ ہی جائے تو...؟''

''تمھاری طرح دارؤ پی کر کوئی بورایا ہوگا تب نا؟''

''سب بورایا ہے رے پگلی۔ پورا دیس۔ سرکار نے سب کو دارؤ پینے کی چھوٹ دی ہے۔ بڑے لوگ اور افسر برانڈی، وائن پیتے ہیں اور غریب لوگ ٹھرّا اور....''

''اچھا، اچھا، بس کرو۔''

''سچ رے۔ جگہ جگہ سرکاری ٹھیکے پر دارؤ بک رہی ہے۔ لائسنس کے لیے مارا ماری تک ہووے ہے۔ توٗ کیا سمجھتی ہے کہ سورگ سے دیوتا لوگ اُتر کر پینے آتے ہیں؟ رام جی کو چڑھائی چڑھائی جاوے ہے؟ ہوئں .... ارے تیرا دھیان کدھر ہے، دارؤ کی دکان اِدھر ہے۔'' مستی میں آکر حاکم نے دونوں ہاتھوں سے کوشلیا کا چہرہ پکڑ کے اپنی جانب گھمایا۔

''چھی، آج بہت باس آ رہی ہے تمھارے منہ سے۔'' اس نے اپنے آنچل کو ناک پر رکھ لیا۔

''آج بہت سڑی ہوئی لاس تھی۔ بدبوٗ کے مارے ایک پیڈل مارنا بھی دُسوار ہو رہا تھا۔ تِس پر سے لاس پھوٗل کر گُبّارہ ہو گئی تھی۔ نہ جانے کب کا مرا پڑا تھا سُسرا۔ سگڑی (باربرداری کا رِکشا) کھسکنے کا نام ہی نہ لے رہی تھی۔''

فہرست

ڈاکٹر نیرجا مادھو - ایک نظر میں --
گزارشِ احوال مترجم
حرفے چند ڈاکٹر الکا پوتدار
ہندی کہانی کا ارتقا - ایک سرسری جائزہ ڈاکٹر غلام نبی مومن

کہانیاں

۱۔ پنّو کے دار جی ۱
۲۔ گہری جڑیں ۱۳
۳۔ بھنوری ۲۵
۴۔ اکیلے چنے کی آزادئے ۳۵
۵۔ حاکم ۴۱
۶۔ تین دھارے ۵۷
۷۔ ابھی ٹھہرو اندھی صدی ۶۷
۸۔ بوئے آدم ۸۱
۹۔ چیک پوسٹ ۹۱
۱۰۔ راستے کی چبھن ۱۰۴
۱۱۔ فیٹ ۱۱۸

''اچھا، تو اسی لیے کس کر جما لیے نوری؟''

''نوری نہیں رانی، لیلیٰ .... لیلیٰ .... بالکل جھک .... پنّی کاٹا اور گٹا گٹ نیچے۔ تب جا کر ہاتھ پیر قابو میں آیا۔''

''کہاں کا تھا بیچارا؟'' وہ منہ گھما کر اسی کے سامنے بیٹھ گئی۔

''پتہ ہوتا تو اس حاکم کا کیا کام؟ اس کے گھر والے کریا کرم کرتے، دسواں تیرھواں کرتے اور لوگ پوڑی کاٹتے۔ تب آج تیرے گھر میں یہ چاول تھوڑے ہی بنتا۔ بھیلی کا ایک ٹکڑا یا نمک مرچی کی چٹنی اور روٹی کھا کر پانی پینا پڑتا۔'' اس نے فخر سے مٹھی میں چاول اٹھا کر دھیرے سے چھوڑ دیے۔

''سب اوپر والا بھیجتا ہے۔ بھات اور گوس آج نصیب ہونا تھا اس لیے بھیج دیا ایک لاوارث لاس۔''

''بڑا کچا دھندا ہے رے کوسلیا۔ کبھی کبھی دو تین مل جاتی ہے تو کبھی ایکو نا ہیں۔''

''ٹٹّی پیساب نہیں نا صاف کر رہے ہو۔ کسی کی انتم کریا کر کے الٹے پُن کما رہے ہو۔'' کوشلیا نے فلسفیانہ انداز میں کہا۔

''ہاں، وارث والی لاسوں کے تو گھر پریوار والے رہتے ہیں سگڑی کے پیچھے پیچھے لیکن لاوارثوں کو گنگا جی میں ڈھکیلتے وقت تھوڑا دکھ ہوتا ہے۔ پتہ نہیں کس خاندان کا ہوگا؟ امیر ہے کہ غریب؟ .... بیچارا نہ جانے کیا کیا سوچ کر گھر سے نکلا ہوگا اور کیسے کیسے اس کا پران نکلا ہوگا؟ اس پر سے چیر پھاڑ اور قاعدے کا دو گز کفن بھی نہیں۔ حاکم کی سگڑی اور گنگا میّا کی گودی۔ بیچارا....''

وہ دوبارہ سیدھا لیٹ گیا۔

''اچھا، آج تک تم چار پانچ سو لاس تو گنگا جی میں پھینک ہی چکے ہو گے؟'' کوشلیا نے اپنا ہاتھ چارپائی کی پٹی پر رکھ دیا۔

''ہاں، اتنے تو ہو ہی چکے ہوں گے۔'' اس نے آسمان کی جانب تاکتے ہوئے جواب دیا۔

''چھی رے، لوگ کیسے گنگا جل پیتے ہیں؟ اگر جان جائیں کہ اتنی لاسیں اس میں پھینکی گئی ہیں تو کوئی چھوئے بھی نہیں، پینا تو دور رہا۔''

''کیا بے وقوفوں جیسی بات کرتی ہے! گنگا میا سب کو پار لگاتی ہیں۔ گنگا جل میں کبھی کیڑے نہیں پڑے ہیں چاہے جتنے برس رکھ لو۔ اتنی مہانتا ہے مائی کی اور تم چھی چھی کر رہی ہو۔ لاسیں کیا اسی میں پڑی رہتی ہیں ایک جگہ؟ ارے کیڑے مکوڑے، جانور کھا پی جاتے ہیں۔ بچا کھچا بہہ کر گنگا ساگر چلا جاتا ہوگا۔''

''ہے مائی، دوکھ پاپ ماف کرو۔ غلطی سے منہ سے نکل گیا۔'' کوشلیا نے اپنے دونوں ہاتھوں میں آنچل تھام کر ماتھے سے لگایا تھا۔

''ہٹو، ہر دم مسخری اچھی نہیں لگتی۔'' حاکم کی حرکت پر یکا یک اس نے اپنا آنچل نیچے کھسکا لیا۔

''گدری بو کب آئی ہے؟'' اس نے اپنی ہنسی روکتے ہوئے پوچھا۔

''ابھی، دوپہر میں اس کا باپ پہنچا گیا۔ نیہر کا نسہ اُتر گیا ہوگا۔ کہتی ہے اُن کی بیماری کا سن کر چلی آئی۔ ہوں، بیاہی ہے گدری کو.... کلیجہ پھٹ رہا تھا....'' کوشلیا اپنی پلاسٹک کی جھگی کی طرف دیکھ کر بڑبڑائی۔

''جانے دو، جب سے سمجھ آ جائے تبھی سے سہی۔ آخر اُس کا گھر والا ہے۔'' حاکم نے سمجھایا۔ اسے معلوم تھا کہ ساس بہو ایک دوسرے کو دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔ آئے دن گھر کے کام کاج کو لے کر کچ کچ ہوتی رہتی ہے۔ گدری کے مہینوں سے بیمار ہونے کی وجہ سے یہ جھگڑا اور بڑھ گیا تھا۔ اکیلے حاکم کی سگڑی اور لاشوں کے ڈھونے سے گھر کا خرچ پورا نہیں ہو رہا تھا۔ کوشلیا چاہتی تھی کہ گدری کی بیوی گھر کے کام کاج کے علاوہ بانس کی پھلٹی چیر کر ٹوکری وغیرہ بھی بُنے لیکن وہ اس کام کے لیے تیار نہیں ہوتی تھی۔

''بیل ہیں کیا ہم جو دن بھر کولھو میں نادھ دو اور ہم پیرتے رہیں، ڈولتے رہیں۔ ہم ہوں ہاڑ مانس سے بنی ہیں۔'' اس نے ساس کو ٹکا سا جواب دے دیا تھا۔

''بیل ناہیں سانڈ ہو سانڈ تم۔ چُھٹّا..... اِدھر اُدھر منہ مارو لیکن دھیلا کا کام نہ کرو۔'' کوشلیا نے تلملا کر پلٹ کے وار کیا۔

''جگہ جگہ منہ ماری ہَو اسی لیے سب کو ویسے ہی....''

گدری بو کی بات پوری بھی نہ ہو پائی تھی کہ کوشلیا نے غصّے سے اس کے بال پکڑ کر زمین پر گرا دیا اور پیٹھ پر ایک لات جماتے ہوئے بولی،

''دن رات سُت سُت کے گدریا کو بیمار کر دیا اور منہ ہم سے مروا رہی ہے سوت۔ بول.... تو رے باپ کے ساتھ منہ مارے تھے کہ تو رے بھائی کے ساتھ؟''

''ایک بار نہیں، سو بار، ہزار بار کہوں گی۔ ٹی وی دیکھنے کے بہانے دلپت کی کوٹھریا میں نہیں جاتی۔ سٹ سٹ کے بیٹھتی ہے تو سب کی آنکھ پھوٹ جاتی ہے؟'' کسی طرح اس نے اپنے بال چھڑائے اور جوڑا بناتے ہوئے بولی تھی۔ ساڑی سر سے گر کے خراب ہوگئی تھی۔ منہ سے جھاگ نکل رہا تھا۔ آس پاس کی جھگیوں سے چھوٹے بڑے، برہنہ، نیم برہنہ، میلے کچیلے بچے اور عورتیں تماشا دیکھ رہی تھیں۔ حاکم اپنی سگڑی لے کر پوسٹ مارٹم ہاؤس گیا تھا۔ اس کے گھر کا چولھا لاشوں کے رحم و کرم پر ہی جلتا تھا۔ کچھ دیر تک ساس بہو کے بیچ بالوں کی کھینچ تان کا کھیل دیکھنے کے بعد تماشائی عورتوں میں سے دو چار نے مل کر دونوں کو الگ کیا۔

کوشلیا ہمدردی حاصل کرنے کے لیے بلک بلک کر رونے لگی —— ''دیکھا، پنچوں! کون کون مصیبت اُٹھا کر اپنے بُڑھوتی کے لیے گدریا کو پالا۔ چار ٹھو پہلے ہی ختم ہو گئے۔ اوجھا سوکھا، ڈیہہ سب کے تھان پر ماتھا پٹکی تب جا کے گدری ہمارے انچرا میں آیا، یہی دن خاطر....''

وہ آنکھوں پر آنچل رکھ کر رو رہی تھی۔ آنسو نہیں بہہ رہے تھے البتہ اس کی شکایت میں دم تھا۔ ٹن کے ڈبوں کی دھم دھم سے اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ میکے جانے کی تیاری کر رہی ہے۔

''ہے ملّوا.... ملّوا رے....'' کوشلیا نے پڑوس کی جھگّی کے پاس فٹ پاتھ پر دوسرے بچوں کے ساتھ کھیل میں مشغول اپنے چھوٹے بیٹے کو پکارا۔

’’ہاں ممی۔‘‘ بول کر ملّو کھیلنے میں مصروف ہوگیا۔

’’ارے جنگی بھر گدری مائی کہا، ملّوا کی ممّی ہوگئی تم تو۔‘‘ حاکم نے چارپائی پر لیٹے لیٹے چٹکی لی۔

’’اب ہم انگریجن تو ہیں نہیں کہ بیگ ٹانگے، چپل پہنے پٹر پٹر انگریجی بولیں۔ لڑِکا ہے۔ سنا ہے اور لوگوں کو کہتے .... پھر ٹی ویوں میں تو سب اپنے مائی باؤ کو اسی نام سے پکارتے ہیں۔‘‘ کوشلیا نے صفائی پیش کی۔

’’لیکن ہم تو ’’باؤاے‘‘ رہ گئے۔ چلو اس سے چھوٹا آئے گا تو ہمیں بھی انگریزی میں کچھ بلائے گا۔‘‘ حاکم نے مذاق کیا۔

’’بھک، بوڑھ سگّا رام رام۔‘‘ کوشلیا شرما گئی۔

’’ارے مرد ساٹھا میں پاٹھا۔ ابھی تو ہم چالیس پوُر کیے ہیں۔‘‘ حاکم نے اپنی مونچھوں پر تاؤ دیا۔

’’مردہ ڈھووَت ڈھووَت گٹھّا پڑ گیا، کھال جھوُل گئی اور بنتے ہو جوان مسٹنڈا۔ ارے کھانا پینا اچھا رہتا تو کوئی بات بھی تھی۔ دودھ، گھی دیہیں لگتا ہے۔ ٹھرا دارؤ سے شریر بنے گا بھلا؟ یہ سب کلیجہ پھونکنے والا ہے۔ روز چڑھا لوگے تو کانباب کے ناتی بن جاؤ گے؟‘‘ کوشلیا نے منہ بنایا اور ملّوا کو دوبارہ آواز دی ——

’’ارے او ملّوا حرام زادہ، کاہیں آتا ناہیں رے؟‘‘

’’ہاں مائی بول ....‘‘ وہ دوڑتے ہانپتے آ کر پاس میں کھڑا ہوگیا۔ کوشلیا کو اور غصہ آ گیا۔

’’کبھی ممّی تو کبھی مائی۔ روز چولا بدلتا ہے پتُریا کی طرح۔ ناس پیٹا کہیں کا۔ جو جا کے مندر والے پوکھرا میں سگڑی دھو کے لے آ۔ رات میں اس پر سوتے جھجک آوے گی۔ نہ جانے کتنے دن کی سڑی لاس لاد لیے تھے۔‘‘

’’اچھا ممی۔‘‘ ملّو ماں کی ڈانٹ سے سنبھل گیا۔ سگڑی لے جانے کے نام پر خوش ہو اُٹھا۔ اسی بہانے اسے اپنے ساتھیوں کو اس پر بٹھا کر چلانے کا مزہ آئے گا۔ وہ اپنی ڈھیلی جانگھیا کو اوپر

کھسکاتے ہوئے سگڑی کی جانب دوڑ پڑا تھا۔

''اور سن، مہارانی کو بول دے کہ مسالہ پیس لیں اور آ کر چاؤر لے جائیں۔ بہن چؤن کے تیار کر دیا ہے۔'' کوشلیا نے اپنی کوٹھری کی جانب اشارہ کیا۔

''بھوجی سے؟'' ملّو نے پوچھا تو کوشلیا ہتھے سے اُکھڑ گئی۔

''ناہیں، ہمار مائی سے۔''

ملّو جھگی کے دروازے ہی سے بھوجی کو مائی کا سندیسہ دے کر تیر کی طرح فٹ پاتھ پر کھڑی ہوئی سگڑی کی طرف بڑھ گیا۔ ننگ دھڑنگ، ناک بہتی ہوئی، بدن کھجلاتے ہوئے درجن بھر بچے شور مچاتے ہوئے سگڑی پر بیٹھنے کی دوڑ میں جٹ گئے۔ شہر کا بیرونی سرا ہونے کی وجہ سے ادھر بھیڑ بھاڑ کم ہوتی تھی۔ ملّو افخر کے ساتھ سگڑی کی سیٹ پر بیٹھ کر پیڈل پر پیر مارنے کی کوشش کرنے لگا تھا۔ اس کوشش میں کبھی وہ اپنے نچلے بدن کو اِدھر ٹیڑھا کرتا، کبھی اُدھر۔ چند ساتھیوں نے پیچھے سے سگڑی کو دھکّا دیا تو وہ چلنے لگی۔ بچوں کا ایک جھنڈ اس پر بیٹھا تھا اور دوسرا بیٹھنے کے لالچ میں اس کے پیچھے پیچھے دوڑ رہا تھا۔ ملّوا دھیرے دھیرے سگڑی کھینچتے ہوئے پوکھرے کی طرف جا رہا تھا۔''

''کہاں چلی مہارانی؟'' کوشلیا نے گدری بو کو بغل والی جھگی کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تو جل بھن کر پوچھ لیا۔

''ایسے ہی۔'' اس نے بھی اسی لہجے میں جواب دیا۔

''سانجھ کی بیلا میں چوکڑیاں مارنا ہے کہ کچھ منہ تک جانے کے لیے رِنھائے گا بھی؟ ملّوا جانے کہاں ہے؟ مسالہ پیس کے گوس اور چاؤر رینھ ڈال۔ ڈاکٹر گدری کو بہت دیر خالی پیٹ رہنے سے منع کیے ہیں۔''

''پہنچتے ہی چولھے میں جھونک دو۔ اِتّی دور سے آ کر تڑنتے بھر سائیں میں جانا تو ہم سے نہیں ہوگا۔'' گدری بو کا ٹکا سا جواب کوشلیا کو نیچے سے اوپر تک چھید گیا۔

حاکم نے سنا تو اس نے معاملے کو سنبھالنے کی کوشش کی۔

''اتنی محنت سے کما کر آدم چنی کا چاؤر اور خصی کا گوس لایا ہوں۔ اس پلیّا سے بنوا کر کاہیں سب چوپٹ کروا رہی ہو۔ تمھارے ہاتھ میں جو بات ہے وہ....''

''ہاں، ہاں، جنگی بھر ہم تو چولھا پھونکنے کے لیے ہی ہیں۔'' وہ ناراضگی کے ساتھ اُٹھی اور جھگی کے اندر چلی گئی۔

حاکم نے تکیے کو موڑ کر اپنے سر کے نیچے رکھ لیا۔ دُہری ہوجانے کی وجہ سے اس میں سے پیلی، مٹ میلی سی روئی کا ٹکڑا باہر نکل آیا۔ تیل اور دھول کی پرتوں میں غلاف کا رنگ چھپ گیا تھا۔ روئی کو پھٹی ہوئی جگہ سے دوبارہ اندر ڈالتے ہوئے اس نے کروٹ بدلی اور اپنا منہ فٹ پاتھ پر بنی ہوئی اپنی جھگی کے ساتھ اَن گنت جھگیوں کی طرف کرلیا۔ نشے میں شام اور خوبصورت معلوم ہورہی تھی۔ جھگیوں میں مٹی کے تیل کے دیے اور لالٹینیں جل گئیں۔ ان کی مدھم زرد روشنی میں زندگی کا کاروبار جاری تھا۔ کہیں بغیر چھیلے ہی آلو کے موٹے موٹے ٹکڑے درانتی سے کاٹے جارہے تھے تو کہیں بڑے تھالے میں آٹا گوندھنے والے کے جسم کا ہلنا ڈلنا جھگی کی دیواروں پر پرچھائیں کی شکل میں کسی عجیب وغریب جانور کا احساس دلا رہے تھے۔ زیادہ تر مرد جھگیوں کے باہر نشے میں دُھت چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے یا روتے ہوئے بچوں کو اپنے آس پاس لیے ڈانٹ پھٹکار کر چپ کرا رہے تھے۔ وقفے وقفے سے کھینی اور بیڑی کی خوراک بھی لے رہے تھے۔ جسم پر برائے نام کپڑے تھے تاکہ مہذب دنیا میں ننگے نہ کہلائیں۔ جب پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے آدھی طاقت دوسری آگ دہکانے کی کوشش میں مصروف ہو تو روتے بلکتے بچے، گالی اور مار کھاتے باپ کی امانت بن جاتے تھے۔ یہ محنت کی فطری تقسیم تھی۔ اس کے علاوہ ساری تقسیم تو مار پیٹ اور زور زبردستی والی تھی۔ اس پر پدری حکومت حاوی تھی۔

دلیپ اپنی جھگی کے باہر بلیک اینڈ وائٹ ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ سڑک کے اوپر سے گزرنے والے بجلی کے تاریں آنکڑی (ہک) پھینک کر وہ ٹی وی کا کنکشن جوڑ لیتا تھا اور دیر رات تک پروگرام دیکھتا تھا۔ صبح کام پر جانے سے پہلے وہ تار کو اُتار لیتا تھا تاکہ پھنسنے پھنسانے کا جھنجھٹ نہ رہے۔ اس وقت بھی اوندھی رکھی ہوئی بالٹی کے اوپر ٹی وی چل رہا تھا۔ آس پاس درجن بھر بچے

اور عورتیں ایک دوسرے کے ساتھ دھکم پیل کرتے ہوئے ٹی وی پر آنے والی تصویروں کو دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ گدری بو بھی انھیں کے بیچ بیٹھی تھی۔ دلپت اپنی چارپائی پر لیٹا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ زور سے ڈانٹ کر سب کو چپ کراتا۔

''ٹھیک سے رہو سب لوگ، نہیں تو بند کر دیں گے۔'' پل بھر کے لیے سناٹا سا چھا جاتا لیکن اگلے ہی پل پھر وہی دبی دبی سی بھنبھناہٹ اور شور۔

حاکم لیٹے لیٹے یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ بھیڑ کی وجہ سے ٹی وی کی تصویریں تو دِکھائی نہیں دے رہی تھیں لیکن آواز اس کے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ جھگیوں والی اس گندی بستی میں بس یہی ایک ٹی وی تھا۔

''اے .... حاکم کون ہے؟'' ایک وردی پوش پولس کی آواز سنائی دی۔ دلپت نے لپک کر ٹی وی بند کر دیا۔

''جی صاحب، اُدھر لیٹا ہے۔'' دلپت نے اشارے سے بتایا۔ ان سب کو معلوم تھا کہ وقت بے وقت کبھی بھی پولس والے حاکم کو ڈھونڈنے یا بلانے آ جاتے تھے۔ کبھی اپنے علاقے میں کسی حادثے میں مر جانے والے آدمی کی لاش کو پوسٹ مارٹم ہاؤس تک پہنچانے تو کبھی انکاؤنٹر میں مارے گئے بدمعاش کی لاش ڈھونے کے لیے۔

پولس والے کے پہنچنے سے پہلے ہی حاکم اپنی چارپائی پر اُٹھ کے بیٹھ گیا۔ شروع شروع میں سپاہیوں کو دیکھ کر وہ ادب سے کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ ان ہی سپاہیوں کی وجہ سے شراب اُتارنے کا دھندا چوپٹ ہو گیا تھا۔ آئے دن کی وصولی اور نوچ کھسوٹ سے تنگ آ کر اس نے سگڑی خرید لی تھی۔ پہلے ہی دن وہ تھانے کے سامنے سے گزر رہا تھا تو داروغہ نے اسے آواز دی ——

''اوئے .... سگڑی۔''

''جی بابو جی۔'' وہ ہاتھ جوڑ کے کھڑا ہو گیا تھا۔

''چل، یہ لاش لاد اور لے جا کر پوسٹ مارٹم ....''

''لیکن بابو جی، ہم اکیلے؟'' وہ ڈر گیا تھا۔ لاش کے اوپر مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔ داروغہ جی

کی ناک پر رومال رکھا ہوا تھا لیکن بدبو کے مارے اس کا برا حال تھا۔

"اکیلے کیا یہ تجھے کھا جائے گا؟" دوسرے سپاہی نے ڈانٹا تھا۔

"نہیں بابو جی، جیسے اس کے گھر والے ...." وہ جھجکتے ہوئے بول اُٹھا تھا۔

"لاوارث ہے لاوارث۔ جھاڑی میں پڑی تھی۔ چل جلدی کر۔"

"بابو جی، ہم گریب مَنئی ...." وہ گڑگڑانے لگا تھا۔ جاڑے کے دنوں میں ماتھے پر پسینے کی بوندیں چمکنے لگی تھیں۔ ریڑھ کی ہڈی میں جیسے جھن جھنی سی ہو رہی تھی۔

"سو روپے کا ہرا نوٹ دے دوں تو تیرا ڈر ختم ہو جائے گا نا؟"

"نہیں بابو جی، وہ بات یہ ہے کہ میری گھر والی...."

"سالے، بڑے حرامی ہوتے ہیں سب۔ موقع تاڑ لیتے ہیں۔ چل ڈیڑھ سو لے لینا۔ اس سے زیادہ دینے پر سرکار ہماری نوکری کھا جائے گی۔ چل، جلدی کر۔"

ڈیڑھ سو روپے کا نام سن کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ کئی کئی دنوں تک محنت کرنے اور چوری چھپے شراب بیچنے پر بھی اس کے پاس اتنے روپے ایک ساتھ جٹ نہیں پاتے تھے اور یہاں کچھ ہی دوری پر لاش پہنچا دینے کے ڈیڑھ سو۔ اس نے ناک پر خوب کس کر انگوچھا باندھ لیا اور لاش کو لاد کر پوسٹ مارٹم ہاؤس کی طرف چل پڑا۔ پیچھے پیچھے تھوڑے فاصلے سے پولس کا ایک آدمی سائیکل پر چل رہا تھا۔ وقفے وقفے سے پیچھے رکھی ہوئی لاش کے بارے میں سوچ کر حاکم کی پنڈلیاں کانپنے لگتیں لیکن گرہ میں بندھے ہوئے ڈیڑھ سو روپے اسے سہارا دے رہے تھے۔

لاش اُتارتے ہی وہاں پہلے سے موجود دوسرے سپاہی نے اسے پکڑ لیا۔

"اے سگڑی والے .... ایک لاش لے جانی ہے۔"

"کہاں؟" اس نے پوچھا۔

"گنگا جی میں .... اور کہاں لے جاؤ گے؟" سپاہی ہنس پڑا۔

"اکیلے ساہب؟"

"تب کیا دو چار لوگوں کے ساتھ؟"

''نہیں ساہب، ہمیں واپس جانا بہت ضروری ہے۔''

وہ بدبو سے پریشان ہوگیا تھا۔ کسی حد تک خوفزدہ بھی تھا۔ بچپن میں بڑھیا مائی مری تھی تو وہ کئی راتیں سو نہیں سکا تھا۔ رات رات بھر بڑبڑاتا رہتا تھا۔ بڑھیا مائی دانت کھولے کھڑی ہیں۔ ڈرا رہی ہیں، بلا رہی ہیں .... اور بھی نہ جانے کیا کیا۔ اوجھا کو دِکھایا گیا۔ اس نے بتایا تھا کہ آسیب کا اثر ہوگیا ہے۔ بہت سارا روپیہ خرچ کرنے کے بعد ہی اس کی جان بچی تھی۔ مرغا اور شراب نذر کی گئی تھی اور سور کے بچے کی بھینٹ چڑھائی گئی تھی۔

''ارے یار لے جا۔ دو سو روپے کے ساتھ ایک پوّا کا دام ہم اپنی طرف سے دیں گے۔'' سب سے وصول کرنے والا شخص اس کی خوشامد کر رہا تھا۔

دو سو روپے اور پوا کا لالچ کم نہ تھا۔ وہ تیار ہوگیا۔ آج لکشمی ماتا مہربان ہوگئی تھیں۔ دو گھنٹے ہی میں ساڑھے تین سو روپے اور پوا۔ اس نے سوچا کہ سگڑی اس کے لیے بڑی ہی مبارک ہے۔

''حاکم ہو تم؟'' پولس والا اس کی چارپائی کے قریب آ گیا تو وہ اپنے بیتے ہوئے دنوں سے باہر نکل آیا۔ چارپائی سے اُٹھتے ہوئے اس نے پوچھا——

''کیا بات ہے؟ داروگا جی بلاوے ہیں کیا؟''

''ہاں، چلو ابھی۔''

''ابھی تو ہم سہر سے آئے رہے ہیں ساہب۔ شریر جواب دے گئی ہے۔ کل سن لیں گے۔''

''نہیں، ضروری کام ہے۔ اسی وقت بلایا ہے۔''

''نہیں، ساہب ٹیم نہیں ہے۔''

''زیادہ شراب پی لیا ہے کیا؟''

''اپنی پیتا ہوں ساہب، دوسرے کی نہیں۔''

''سالے، زبان لڑاتا ہے۔'' شاید پولس والا نیا تھا۔ غرانے لگا۔

''ہے ساہب، ای دھونس دوسرے کو دِکھایئے گا۔ حاکم کسی کا غلام نہیں۔'' وہ دھم سے

چارپائی پر بیٹھ گیا۔

''ارے یار حاکم، تو بڑے کام کی چیز ہے۔ چلو، چلو۔ ایک ٹھولاش آئی ہے تھانے پر۔ بس اس کو ٹھکانے پر پہنچا کر چلے آنا مائی باپ۔'' دوسرے سپاہی نے اسے منانے کا ڈھونگ کیا۔

''آپ کہہ رہے ہو ساہب تو چلا چلتے ہیں، لیکن بڑے ساہب سے کہہ دینا کہ چار سو سے نیچے بات نہیں کریں گے۔'' حاکم اپنی شرط بتاتے ہوئے چلنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا۔

''ہم لوگوں کی نوکری کھا جاؤ گے کیا مائی باپ۔ سرکار اس کام کے لیے دیتی ہے دو سو روپیّا اور ہم کیا چار سو روپے اپنے پاکٹ سے دیں گے؟'' سپاہی نے ہنستے ہوئے اپنی پوزیشن واضح کردی۔

''ارے ساہب، بڑا بڑا لوگن کا پاکٹ آپ لوگ چکّن کر دیتے ہیں۔ ہم غریب کو دے دیں گے تو پاپ ہوگا؟'' حاکم نے جھگی کی طرف منہ کر کے کوشلیا کو بتایا —— ''سنو، ہم ذرا جا رہے ہیں تھانے تک۔ بڑے ساہب بلائے ہیں۔ تھوڑی دیر میں آ جائیں گے۔ تب تک کھانا پکا کے رکھیو۔''

''پیدل جاؤ گے؟ سگڑی تو ملّوا لے گیا ہے پوکھری پر دھونے۔'' اندر سے کوشلیا کی آواز آئی۔

''اُدھرَے سے لے لؤں گا۔'' کہہ کر تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے پولس والوں کے ساتھ ہولیا۔

سگڑی لے کر تھانے پہنچا تو بڑے داروغہ صاحب بے صبری سے اس کا انتظار کر رہے تھے۔

''آؤ حاکم۔ جلدی کرو بھائی۔ یہاں تو بیٹھنا محال ہوگیا ہے۔'' بڑے صاحب نے موٹا سا تولیہ اپنے منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

''ارے ساہب، ای تو بالکل سڑ گئی ہے۔ پانچ سو سے ایک پیسہ کم نہیں ساہب۔'' اس نے لاپرواہی سے بڑے صاحب کی طرف دیکھا اور ایک کونے میں جا کر کان پر کھونسی ہوئی بیڑی

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

نکال کر سلگانے لگا۔

''کیا! اب تک چار سو تھا، اور اب پانچ سو مانگ رہے ہو۔ اندھیر ہے کیا؟'' پہلے والا سپاہی غرایا۔

''ساہب، ہم تو پہلے ہی کہے تھے کہ ہمار سریر آج ساتھ نہیں دے رہا ہے۔ آپ کسی اور سے طے کر لیجیے۔ ہمارا بیٹوا گدریا بھی کئی مہینا سے بیمار چل رہا ہے۔ اس کی دوا لے آنے جانا تھا ابھی۔'' حاکم واپس جانے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

''بلیک میل کر رہا ہے سالا ہم کو۔'' چھوٹے داروغہ نے اپنے بوٹ سے زمین پر ٹھوکر مار کر دھول اُڑائی۔ بلب کی پیلی روشنی میں سفید کپڑے میں پنچ نامہ کر کے بندھی ہوئی لاش کے اوپر کالی کالی مکھیاں بھنبھنا رہی تھیں۔

''آپ کسی اور سگڑی والے کو بلا لیجیے ساہب۔'' اس نے قدم آگے بڑھایا۔

''تمھیں معلوم ہے کہ اس علاقے میں اور کوئی سگڑی والا یہ کام کرنے کو تیار نہیں ہوگا اسی لیے رنگ مار رہے ہو؟ اور وہ بھی ہم پولس والوں سے؟'' پہلے والا سپاہی پھٹ پڑا۔ بہت دیر سے وہ حاکم کے نخرے برداشت کر رہا تھا۔

''تم چپ رہو مسٹر رام۔ اے چوکیدار، میری میز کے بغل میں کل چھاپے میں برآمد ہوئی جو انگریزی وائن ہے، اس میں سے ایک بوتل لے آؤ۔ حاکم کو دے دو۔ صحیح بات ہے، اتنی سڑی ہوئی لاش وہ کیسے لے جائے گا۔ تھوڑا سرور رہے گا تو جلدی پہنچ جائے گا۔'' بڑے داروغہ نے اپنے چوکیدار کو حکم دیا اور حاکم کو پچکارنے لگا۔

''دیکھو حاکم، ہماری بھی مجبوری سمجھو۔ ہم قاعدے سے باہر نہیں جا سکتے۔ یہ چار سو رکھ لو۔ اس میں بھی ہم دو سو روپے آپس میں چندہ اکٹھا کر کے دے رہے ہیں تمھیں۔ سرکار کو کیا خبر کہ حاکم اب دو سو نہیں، چار سو پانچ سو مانگتا ہے۔''

''روز نہیں نا چار پانچ سو مانگتے ہیں۔ جب کوئی مرے گا تب نا۔'' انگریزی شراب کو ڈھٹائی سے پولس والوں کے سامنے ہی گلے سے نیچے اُتارتے ہوئے حاکم ہنسا تھا۔

''تم تو مناتے ہوگے کہ روز ایسے ہی کوئی مرے، سڑے گلے، کیڑے بلبلائیں تا کہ تمھارا دام اور بڑھے۔'' ایک کانسٹبل ہنستے ہوئے بولا۔

''رام، رام ساہب، ایسا کاہیں سوچوں میں۔ ہمارے بھی بال بچے ہیں۔ کاہیں ایسی بات سوچوں گا۔ ایسا ابھاگ کسی کے ساتھ کیوں ہووے ساہب کے مرتے بکھت اس کے پاس کوئی نہ رہے۔ نہ نصیب ہو نَو من لکڑی نہ ڈھائی گز کفن۔ مرنے کے بعد بھی دُرگتی۔''

لاش کو سگڑی پر لادتے ہوئے حاکم نے کہا تھا اور اُچھل کر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پیسہ پہلے ہی انٹی میں کھوس لیا تھا۔

''چل بھیا، توہرَو کام ختم ہو۔ واہ رے وِدھاتا، توہرَو کھیل نرالا ہے۔''

سگڑی پوسٹ مارٹم ہاؤس کی طرف چل پڑی۔

''دنیا سے جانے والے جانے چلے جاتے ہیں کہاں ....'' پیڈل مارتے ہوئے حاکم گا رہا تھا۔ نشہ اسے اپنی گرفت میں لے رہا تھا۔ وہ لاش کے ساتھ یک طرفہ بات چیت کر رہا تھا۔

''کیا کرم کیے تھے بھیا کہ انتم سمے توہرے کے ساتھ کوئی نہیں رے .... چل اچھا، حاکم ہے نا؟ تمھارا بیڑا پار۔ کچھ دیر چھینی ہتھوڑی کی چوٹ کھالو پھر گنگا میّا کی گودی میں آرام سے سو جانا۔ مہرارؤ کو تو پتہ نہیں ہوگا۔ وہ چونّی بھر کا ٹِکُلی اور سیندر لگائے تمھارا راستہ دیکھ رہی ہوگی اور تم لدے ہو حاکم کی سگڑی پر۔ واہ بھیّا واہ۔ منہ چرائے بھاگ آئے سنسار سے .... بیٹی بیٹا ہیں کہ ناہیں تمھارے؟ ....کوئی بیمار تو نہیں نا؟ دوا دارؤ دے کے آئے ہوتے حاکم کے پاس۔ دارؤ تو اپنے پاس ابھی تھوڑی سی ہے۔ پیے گا؟ ....کبھی چکھا تھا کہ نہیں؟ نیمی دھرمی رہے ہوگے تو کیا جانو سواد؟ .... پتہ نہیں .... ایک بار تو ایک نیمی دھرمی بیچارہ ریل گاڑی کے غسل خانے میں مر گیا تھا۔ وہ بھی میری ہی سگڑی پر لد کے آیا تھا —— پوسٹ مارٹم گھر تک۔ بعد میں لڑکے روتے بلکتے آئے لاش لینے۔ ہم نے تو بہت لجوایا۔ بوڑھے باپ کو احمد آباد سے اکیلے ریل گاڑی میں چڑھا دیے اور کوئی چنتا نہیں کی کہ کیسے پہنچیں گے گھر تک؟ وہ بھی بیمار بزرگ باپ؟ بڑھوتی کا شریر کب دغا دے جائے بھیّا، کون جانتا ہے؟ دغا نوجوان دے جائیں، بڑھوا کا کیا؟ اب تم ہی جوان ہو کہ

بوڑھے، میں کیا جانوں؟ .... چلو لدے رہو میری سگڑی پر۔ کم سے کم جوان ہو گے تو باپ کے کندھے پر تو نہیں چڑھو گے نا؟''

وہ بڑبڑاتا جا رہا تھا اور رات گہری ہوتی جا رہی تھی۔ سڑک پر لوگ آ جا رہے تھے۔ اسٹریٹ لائٹ میں سڑک کے دونوں جانب بنے ہوئے پکّے گھروں کے باہر لان میں لوگ کرسیاں لگائے بیٹھے تھے۔ گرمی اور سردی کا درمیانی موسم تھا۔ راستے میں اس ڈاکٹر کا گھر بھی آیا تھا جس کی دوا وہ گدری کے لیے کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ گدری کا لیور خراب ہو گیا ہے۔ تیل مسالہ اور بھاری چیز سے پرہیز تھا۔ جوانی میں یہ بیماری! بیچارا گدری۔ حاکم نے ایک بار ٹھٹھک کر سوچا تھا کہ گدری کی دوا اسی وقت خرید لے۔ لیکن کسی کے دروازے پر مردہ لے کر رکنا مناسب معلوم نہیں ہوا۔ اور سنتری تو اسے مار کر کچومر ہی نکال دیتا۔ بڑی بڑی مونچھوں والا ڈاکٹر کا سنتری بالکل یمراج لگتا ہے۔ اسے نہیں جانا یمراج کے پاس ابھی۔ لوٹتے ہوئے وہ دوا لے لے گا۔ اس نے پیڈل پر تیزی سے پیر مارے۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے ایک بار پھر نشے میں ڈوبے اس کے دل کو خوش کر دیا تھا۔ وہ الاپنے لگا —— ''اے ہی ٹھیّا جھُلنی ہیرانی ہو دیّا ....''

''ارے اے حاکم .... حاکم ہو ....'' پیچھے پیچھے سائیکل سے دلیپ ہانپتے ہوئے پکار رہا تھا۔

''کیا ہے دلیپ؟'' حاکم نے سگڑی روک لی تھی۔ پیچھے آتا ہوا پولس والا غرایا۔

''کیا ناٹک کر رہے ہو جی؟ زیادہ چڑھ گئی ہے کیا؟ چلو جلدی۔''

''ارے حاکم، گدری کی حالت خراب ہو رہی ہے۔ شاید چپکے سے گوس کھا لیا۔ مارے اُلٹی اور دست ۔ کے برا حال ہے۔ خون بھی دِکھائی دیا ہے منہ سے۔'' دلیپ گھبرایا ہوا تھا۔ حاکم کا نشہ کافور ہو گیا۔ وہ سگڑی سے اُتر پڑا۔

''اے .... اے .... یہاں سڑا مردہ لے کر کیا بحث کر رہے ہو؟ بڑھو جلدی آ گے۔'' ایک مکان مالک غرایا۔

''چھی، چھی، بڑے بدتمیز ہیں جی۔ سانس لینا دوبھر ہو گیا ہے۔ سگڑی لے کر جاتے کیوں نہیں جی؟'' دوسرے گھر سے آواز آئی تھی۔

''ساہب، آپ دوسری سگڑی کر لیجیے۔ میرے لڑکے کی حالت خراب ہے۔ میں جاؤں گا۔'' حاکم نے ساتھ میں چلتے ہوئے پولس والے سے گڑگڑا کر بولا۔

''ارے، اب اس جگہ سے میں دوسری سگڑی کیسے کروں؟ پیسہ تم پورا لے چکے ہو اور دوسری سگڑی اب میں کھوجوں؟ تب تک مردے کو یہاں کالونی والے رہنے دیں گے؟''

حاکم نے ایک بار اپنی انٹی میں کھونسے ہوئے روپیوں پر ہاتھ رکھا دوسری سگڑی کر لینے کے لیے لیکن اگلے ہی پل دوا کا خرچ یاد آ گیا تو اس نے ہاتھ ہٹا لیا۔ جلدی سے سگڑی پر چڑھ گیا اور پیڈل مارنے لگا۔ اس کی آنکھیں پوسٹ مارٹم ہاؤس کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ادھر جھگی میں گدری کی آنکھیں خلا میں ٹنگی تھیں۔

* * *

تین دھارے

وشوکرما پوجا کا دن تھا۔ ابھی سورج پوری طرح نہیں نکلا تھا۔ کالے بادلوں نے سورج کو اپنی اوٹ میں چھپا رکھا تھا۔ وہ سورج کو منہ کھولنے نہیں دے رہے تھے۔ طغیانی پر آئی ہوئی گنگا گھاٹوں اور مندروں سے ٹکرا ٹکرا کر بہہ رہی تھی۔ بس ایک معمولی سی کہانی تھی انجنا کی جس نے پار کے گاؤں اور قصبے سے لے کر گنگا کی گود تک کی فضا کو محیط کر رکھا تھا۔ اپنے کرم کا پھل پانے کے بعد بھی متوسط طبقے کی لڑکی انجنا کی سانسیں چل رہی ہیں؛ وہ زندہ ہے۔ ہاں، اس کرم کو انجام دینے والے کے بارے میں اختلافِ رائے ہے۔ اسے باپ کہیں، محبوب یا وہ بدنصیب شوہر جس سے چند مہینے قبل ہی انجنا کا بیاہ ہوا تھا۔ خواہ کوئی بھی ہو، کہانی اسی کے گرد گھوم رہی ہے۔ باپ کی خواہش کے آگے سر جھکاتے ہوئے انجان آدمی سے شادی کرنے کے لیے مجبور انجنا، محبوب کو بھول نہ پانے کے سبب بدائی سے قبل ہی اس کے ساتھ بھاگ جانے کا فیصلہ کرنے والی انجنا اور محبوب کے ذریعے بیس پچیس دنوں میں ہی زندگی بھر کا لطف اُٹھا لینے کے بعد گلے پڑی ہوئی مصیبت کو گنگا میں بہا دینے تک کی سازش کی کہانی کا کردار انجنا۔ سب کچھ باڑھ کے پھیلے ہوئے پانی کی طرح صاف اور واضح ہے۔ ایک عام سی پریم کہانی لیکن ایسے سماج کی جہاں پریم عام بات نہیں بلکہ ایک واقعہ ہے جو وقفے وقفے سے حادثے کی شکل اختیار کر لیتا ہے —— ماضی سے حال تک۔

انجنا کی اس کہانی کے مثلث کو ادب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہیں تو خیالات کے تین دھارے اُبھر کر سامنے آتے ہیں —— پہلا روایتی، دوسرا ترقی پسندانہ اور تیسرا تانیثی نقطۂ نظر۔

روایتوں پر ترقی پسندی کی زور زبردستی چل رہی ہے .... کبھی یہ چت تو کبھی وہ پٹ۔ ترقی پسندی مافیا کی طرح کچھ وصول کر کے دائیں بائیں ہو لیتی ہے اور پھر شروع ہوتا ہے

روایت پرستی کا شور شرابہ۔ ترقی کے نام پر مضبوط سے مضبوط روایتیں چٹختی رہتی ہیں۔ کبھی کبھی یہ ٹوٹ بھی جاتی ہیں۔ ایسی ہی ایک روایت بابو امرناتھ رائے کے گھر کی ٹوٹی تھی۔ رائے صاحب خاندانی رئیس تھے۔ وہ ذات سے رائے نہیں تھے۔ انگریزوں سے قربت کے نتیجے میں انھیں چار آنے کی زمینداری اور رائے بہادر کا خطاب ملا تھا۔ زمینداری تو چھن گئی لیکن خطاب آج تک نسل در نسل منتقل ہوتا آ رہا تھا۔ اصل ذات شدروں سے ایک زینہ اوپر یعنی ویش یعنی برہما کی جانگھوں کی شان و شوکت خون میں گھلی ہوئی تھی اس لیے مستحکم روایتوں کے مربی تھے۔

کھانے پینے، شادی بیاہ وغیرہ میں اپنی ذات کو خالص رکھنے کا فخر اکثر رائے صاحب کی سفید مونچھوں میں جھلکتا دِکھائی دیتا تھا۔ بیٹی بیٹے کی شادی کے موقع پر دروازے پر دولھا دلھن کی آؤ بھگت سے لے کر سمدھی ملن تک ان کی پیلی دھوتی اور گلابی پگڑی سے روایت پسندی کا اظہار ہوتا تھا کیونکہ شادی اور محبت جیسے معاملوں میں صرف پیر سے پیدا ہونے والے طبقے ہی میں ترقی پسندی کھلے عام جاری ہے اور وہ بھی پورے کر وفر کے ساتھ۔ آج فلاں کی بیٹی کا اپنے آدمی سے چھٹکارے کے لیے پنچایت ہے۔ فلاں نے اپنی پہلی والی کو چھوڑ کر چار بچوں کی ماں سے سگائی کر لی۔ فلاں کا آدمی کمانے کے لیے لدھیانہ گیا اور اس کی گھر والی اپنے جیٹھ کے ساتھ بیٹھ گئی۔ روایتوں کے منکروں اور ترقی پسندی کے حامیوں نے تانیثیت کے نظریے کی تشکیل کی ہے۔ عورتوں کو وہ سارے حقوق حاصل ہیں جو مردوں کو ملے ہوئے ہیں۔ وہ محنت ساتھ ساتھ کرے گی تو سگریٹ بیڑی، شراب نوشی میں بھی پیچھے نہیں رہے گی۔ مرد کا ہاتھ اکثر اُٹھتا ہے تو کبھی کبھار عورت کے ہاتھ میں بھی چولھے کی جلتی ہوئی لکڑی آ جاتی ہے اور تب مرد دُم دبائے اِدھر اُدھر ہو جاتا ہے۔

ترقی پسندی اور تانیثیت کا ڈھکا چھپا روپ کبھی کبھی انتہائی ترقی یافتہ سماج اور نام نہاد اعلیٰ طبقے میں بھی نظر آ جاتا ہے لیکن روایت پرستی مکمل طور پر متوسط طبقے کے لیے مخصوص ہو کر رہ گئی ہے جبکہ ترقی پذیری پیر اور دماغ سے پیدا ہونے والے طبقوں کے نام وقف ہو گئی ہے۔

بابو امرناتھ رائے کے گھر کی روایت ٹوٹی اور ان کی چھوٹی بیٹی انجنا کو جو پانچویں نمبر کے بیٹے سے بڑی تھی، مخلوط تعلیم والے انٹر کالج میں داخلہ دلایا گیا۔ یہاں ایک ساتھ کئی مجبوریاں

تھیں۔ ایک تو گاؤں کے آس پاس میں لڑکیوں کا کوئی کالج نہیں تھا۔ تھا بھی تو زیرِ تعمیر۔ سننے میں آیا تھا کہ لڑکیوں کی تعلیم کے نام پر لاکھوں کی امداد حاصل کرنے کے لیے اس کالج کی تعمیر کرائی جا رہی تھی لیکن افسروں اور انتظامیہ کمیٹی کی ملی بھگت سے سارا کاروبار کچھوے کی رفتار سے چل رہا تھا۔ رائے صاحب کو اُمید تھی کہ جب بھی یہ کالج بن جائے گا وہ انجنا کا نام وہاں سے کٹوا کر یہیں لکھوا لیں گے۔ جان سوُلی پر لٹکی رہتی ہے۔ سیانی لڑکی وسیع و عریض کھیت پار کر کے کالج جاتی ہے۔ اِدھر اُدھر کہیں پاؤں پڑ جائے تو؟ کچھ دنوں تک بڑا بیٹا اَوَدھیش اسکوٹر سے لے جاتا رہا لیکن دن میں گھر سے چار چکر آنا جانا جسم سے زیادہ جیب کو تھکا دیتا تھا۔ اپنے گھر پریوار کی ساکھ قائم رکھنے کے لیے رائے صاحب کو جو پاپڑ بیلنے پڑ رہے تھے، اسے وہی سمجھتے تھے۔ پانچ بیٹوں میں سے صرف ایک کسی طرح کلرک کی نوکری حاصل کر پایا تھا۔ باقی کھیتی باڑی سے کسی طرح عزت ڈھکی جا رہی تھی۔ انجنا کے لیے سائیکل خرید دی۔ پڑوس کے رام سموُجھ وِشوکرما کا دس برس کا پوتا بھی اسی ادارے میں چھٹی کا طالب علم تھا۔ اکثر وہ بھی اپنی ٹوٹی ہوئی سائیکل سے کھڑ کھڑ کرتا انجنا کے پیچھے پیچھے چلتا۔ اس کے پاؤں ابھی پیڈل تک نہیں پہنچتے تھے اس لیے سیٹ پر سے ہی کبھی دائیں تو کبھی بائیں ٹیڑھا ہو کر پیر سے پیڈل کو ڈھکیلتا۔ انجنا اکثر اپنی ماں سے شکایت کرتی —— ''یہ کیا ایک پہریدار کے ساتھ بھیج دیتی ہو اماں؟ جی میں آتا ہے کہ چھوڑ کر چلی جاؤں اس پپوا کے بچے کو۔ راستے میں پندرہ بار چین اُترتی ہے اس کے سائیکل کی اور پندرہ دوُنا تیس منٹ دیر سے میں کالج پہنچتی ہوں۔''

''ارے انجو، چھوٹا ہے بیچارہ۔ تیرے ساتھ رہتا ہے تو اس کے ماں باپ بھی بے فکر رہتے ہیں۔ سنسان راستہ ہے۔ بچہ ہے، ڈر بھی سکتا ہے۔ تجھے بھی سہارا رہتا ہے۔'' ماں انجنا کو سمجھاتی۔ لیکن حقیقت یہ تھی کہ پپو کو ساتھ بھیج کر وہ لوگ بے فکر رہتے تھے۔ کم سے کم گاؤں پڑوس کا کوئی تو ساتھ ہوتا ہے انجنا کے۔ رام سموُجھ سے کہہ کر ہی رائے صاحب نے پپو کا داخلہ بھی انجنا کے ہی کالج میں کروا دیا تھا۔ غریبی کی وجہ سے رائے صاحب نے خود پرنسپل صاحب سے بات کر کے پپو کی فیس معاف کروا دی تو رام سموُجھ زیرِ بار احسان ہو گیا۔

''بابو صاحب، ہمارا پپوا ہے چھوٹا لیکن بڑا ہوشیار ہے۔ بڑے بڑوں کے کان کاٹتا ہے۔ لاؤنی کے وقت کیا مجال کہ ایک ڈنٹھل بھی اِدھر سے اُدھر ہوجائے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔ وہ پرچھائیں کی طرح انجنا بٹیا کے ساتھ لگا رہے گا۔''

''ارے ایسی کوئی ڈکیتی تھوڑے ہی پڑ رہی ہے جو وہ پرچھائیں کی طرح لگا رہے گا۔ بس میں تو ساتھ آنے جانے کے لیے کہہ رہا تھا۔ لڑکی ذات، اتنی دور آتی جاتی ہے، بس۔'' رائے صاحب کے غرور کو جھٹکا لگا تھا۔

اور ڈکیتی تو پڑی تھی۔ پہلے انجنا کے نوجوان دل میں نقب لگی اور پھر ڈکیتی بھی ہوئی۔ ساتھ ساتھ جانے والا پپوا اب لوٹتے وقت کبھی کبھی اکیلے آنے لگا تھا۔ ایک دو بار رائے صاحب نے انجنا سے پوچھا تو اس نے ایکسٹرا کلاس کا بہانہ کردیا۔

''چل، آج میں تجھے چھوڑ آتا ہوں۔ اُدھر سے ہی شہر چلا جاؤں گا۔ کچہری سے لوٹتے ہوئے تجھے واپس لے بھی لوں گا۔'' ایک دن خود رائے صاحب نے تجویز پیش کی۔ لڑکی ذات کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے چیک کرتے رہنا چاہیے۔ ان کے خاندان میں لڑکیوں کو رامائن، گیتا پڑھ لینے کی حد تک ہی ہندی کی تعلیم دلانے کا رواج تھا۔ اب تو ترقی کے نام پر عورتوں کی تعلیم کی مانگ لڑکے والوں کی طرف سے ہونے لگی ہے۔ جہیز میں کوئی کمی نہیں ہوئی البتہ لڑکیوں کی پڑھائی کا بوجھ اور فکر بھی سر پر سوار ہوگئی ہے۔ مرتا کیا نہ کرتا؟ بغیر پڑھائے اچھا دولھا ملنا مشکل تھا۔ گاؤں کے تیواری کی بڑی لڑکی بیوہ ہوگئی تو سسرال والے اپنے بوجھ کو میکے میں پٹک گئے۔ اب بیچارے تیواری جی بیوہ بیٹی اور اس کے تین چھوٹے بچوں کی پرورش کررہے ہیں۔ ایک فکر انھیں گھن کی طرح چاٹ رہی ہے کہ ان کے بعد بیٹی اور اس کے بچوں کا کیا ہوگا؟ بیٹے تو ابھی سے اپنا اپنا پریوار لے کر الگ ہوگئے ہیں۔ اس طرح کا خوف بھی رائے صاحب کی مجبوری بن گیا تھا۔

انجنا چپ چاپ پتا جی کی اسکوٹر پر بیٹھ گئی۔ اس کے چہرے پر فکر کی لکیریں اُبھرتی اور مٹ جاتیں۔ کہیں پُلیا پر بیٹھ کر انتظار کرتا ہوا دیوراج پتا جی کے سامنے کوئی ناسمجھی والی حرکت نہ کر بیٹھے۔ گنگا کے اُس پار شہر ہے اور اِس پار قصبے میں اس کا گھر ہے۔ روزانہ وہ اسکوٹر سے آ کر اسی

پلیا پر اس کا انتظار کرتا ہے۔ اکیلی رہنے پر وہ گھنٹہ آدھ گھنٹہ بیٹھ کر اس سے بات کر لیتی۔ پپو کے ساتھ ہونے پر وہ بس اس کی سائیکل کے آگے پیچھے اسکوٹر پر دھیرے دھیرے چلتا رہتا۔ ایک دوسرے کو صرف دیکھ لینے سے بھی دل کی پیاس بجھ جاتی۔ جب دیوراج سے جان پہچان نہیں تھی تب بھی نہ جانے کیوں انجنا کی سائیکل ٹپلیا کے پاس آ کر دھیمی ہو جاتی۔ دوپٹہ ٹھیک کرنے کے بہانے اسے دیکھ لیتی۔ اسے بھی اپنی طرف دیکھتا ہوا پا کر اس کی ہتھیلیاں پسیج جاتیں۔ اس وقت پلیا کی مرمت کا کام جاری تھا۔ دیوراج نے ہی اس کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ اپنے اسکوٹر پر بیٹھے بیٹھے وہ مزدوروں اور مستریوں کے کاموں کا جائزہ لیتا رہتا۔ انجنا کو آتا ہوا دیکھ کر وہ اُٹھ کے اِدھر اُدھر ٹہلنے لگتا۔ ہدایتیں دینے کے بہانے اسے انجنا کو بھرپور نگاہوں سے دیکھنے کا بہانہ مل جاتا۔ ٹپلیا کے بغل والے تنگ راستے سے پپو کے ساتھ اپنی سائیکل کا ہینڈل سنبھالے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی انجنا کو اپنی آنکھوں میں بساتے ہوئے دیوراج کو پپو کباب میں ہڈی معلوم ہوتا۔ ایک دن اس نے اسے نشانہ بنا کر اپنے مزدور سے کہا تھا——

''اپنے ساتھ یہ دُم چھلا لے کر کیا چلتے ہو؟''

''جی صاحب، کیا؟ ہم سمجھے نہیں؟''

مزدور بھلے نہ سمجھا ہو لیکن انجنا دیوراج کی بے چینی اچھی طرح سمجھنے لگی تھی۔ اسے اچھا بھی لگتا تھا دیوراج کو پاگلوں کی طرح اپنی طرف متوجہ دیکھ کر۔

ایک دن پپو نے ٹپلیا پر سے گزرتے ہوئے اس سے پھسپھسا کر کہا تھا، ''دیدی، کل آپ چھٹی پر تھیں۔ میں اکیلے ہی اسکول جا رہا تھا۔ یہ صاحب جی نا....'' وہ جھجک گیا۔

''کون صاحب رے؟'' انجنا نے تنک کر پوچھنے کی اداکاری کی۔

''ارے وہی، دیکھ نہیں رہی ہیں جو لال کوٹ اور سفید پینٹ پہنے ہیں؟'' پپو نے ٹپلیا پر کھڑے ہوئے دیوراج کی طرف اشارہ کیا تھا۔ انجنا کو بھی اسے دیکھنے کا ایک موقع مل گیا تھا۔ دیوراج سے آنکھیں ملیں اور نہ چاہتے ہوئے بھی دونوں کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

پپو نے یہ سب دیکھا تو آگے کی بات بتانے کی ہمت ہوئی۔

''دیدی، وہی جو ابھی آپ کو دیکھ کر مسکرا رہے تھے۔''

''اچھا، اچھا، وہی۔ ہاں تو کیا کہہ رہے تھے؟''

''کہہ رہے تھے کہ میں ایک کاغذ دوں تو تم اپنی دیدی کو دے دو گے؟'' پپو نے بتایا۔

''تو نے لے لیا کیا؟'' انجنا کے لہجے سے بے تابی عیاں تھی۔

''نہیں، آج دینے والے تھے۔ لے لوں جا کر؟''

''میں کیا جانوں؟ یہ تیرا اور ان کا معاملہ ہے۔ میں کیوں بیچ میں پڑوں؟'' انجنا کے دل میں خوش کن محبت کی ایک لہر سی اُٹھنے لگی تھی۔

اور اس پہلے کاغذ کے لین دین کے بعد واسطے کو قطع کر دیا گیا تھا۔ دل کے معاملات میں کسی واسطے کی ضرورت بھی کیا ہے؟

اُڑتی اُڑتی خبر رائے صاحب کے کانوں تک پہنچی تو کان کھڑے ہو گئے۔ لیکن انجنا سے براہِ راست پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ کہیں بات صحیح نکلی اور زمانے کی دیکھا دیکھی انجنا میں بھی آنکھیں ملا کر اپنا فیصلہ سنانے کی جرأت آ گئی تو خاندان کی عزّت خاک میں مل جائے گی۔ اس لیے انھوں نے پہلے پختہ ثبوت ڈھونڈنے کی بابت سوچا۔ ہوسکتا ہے یہ سب لڑکی کو بدنام کرنے کی نیچ حرکتیں ہوں۔

اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبتے اُبھرتے رائے صاحب اور انجنا اسکوٹر سے پُلیا کے قریب پہنچنے والے تھے۔ پُلیا سے ذرا پہلے انجنا چوکنا ہو کر اپنی سیٹ پر کسمسائی تھی۔ بیٹی کی کسمساہٹ کو محسوس کر کے رائے صاحب بھی قدرے چوکنے ہو گئے تھے۔ انھوں نے چلتی اسکوٹر پر ہی اپنے بیٹھنے کی پوزیشن کو تھوڑا سا بدلا تھا۔ پرانی سیٹ چرمرائی تھی۔ سائڈ گلاس کو تھوڑا سا دائیں جانب گھما دیا۔ پیچھے بیٹھی ہوئی انجنا کا چہرہ اب اس میں صاف دِکھائی دے رہا تھا۔ اس کے چہرے کے جذبات کو پڑھنے کے لیے انھوں نے رفتار تھوڑی دھیمی کر دی اور سامنے پُلیا پر نگاہ دوڑائی۔ اسکوٹر پر بیٹھا ہوا ایک نوجوان بے فکری کے انداز میں سگریٹ پھونک رہا تھا۔ بڑھے ہوئے بال اور جدید تراش کی تنگ پینٹ سے اس کی شخصیت کا دل ہی دل میں اندازہ کرتے ہوئے انھوں نے شیشے

گزارشِ احوال

راقم الحروف پچھلے کئی برسوں سے ہندی کہانیاں بڑے ذوق و شوق سے پڑھ رہا ہے۔ بعض کہانیوں نے دل پر گہرے نقش چھوڑے۔ اُردو قارئین کو ہندی کی بعض اچھی کہانیوں سے روشناس کرانے کے لیے انھیں اُردو میں منتقل کیا۔ دو چار ترجمے اُردو رسالوں میں شائع ہوئے تو حوصلہ بڑھا اور مزید ترجموں کا سلسلہ چل پڑا۔ ان ترجمہ شدہ کہانیوں میں سے سات کہانیوں کا انتخاب ’دھنک‘ کے نام سے ۲۰۰۲ء میں منصۂ شہود پر آیا۔

اس دوران ہندی کے کسی ایک افسانہ نگار کو اُردو قارئین سے مکمل طور پر متعارف کرنے کا خیال آیا۔ ڈاکٹر نیرجا مادھو کی بعض کہانیوں نے مجھے بے حد متاثر کیا تھا۔ اس لیے نظرِ انتخاب ان پر پڑی۔

میں نے فون پر اپنا عندیہ ظاہر کیا تو انھوں نے اپنی پسندیدہ کہانیوں کی فوٹو کاپیاں روانہ کردیں اور نتیجتاً ان کہانیوں کے اُردو ترجمے پر مشتمل یہ مجموعہ بعنوان ’گہری جڑیں‘ وجود میں آیا۔ اس عنوان کی کہانی زیرنظر مجموعے میں شامل ہے۔

اس مجموعے کو پڑھ کر قارئین کو اندازہ ہوجائے گا کہ نیرجا مادھو کی کہانیوں کے موضوعات میں بڑا تنوع اور اسلوب میں بڑی ندرت ہے۔ نیرجا جی کی کہانیوں کے کردار ہندوستانی معاشرے کے جیتے جاگتے کردار ہیں اور خصوصاً محروم طبقات کی بھرپور نمائندگی کرتے ہیں۔ ان

میں دیکھا۔ یکا یک ان کی بھنویں تن گئیں۔ خاندانی خون کھولنے کی حد تک گرم ہو اُٹھا۔ تو یہ بات ہے۔ آگ کے بغیر دھواں نہیں اُٹھا کرتا۔ انجنا ان کی بے چینی سے بے خبر اپنے ہونٹوں پر ایک ہاتھ کی شہادت کی اُنگلی رکھے اس نوجوان کو چپ رہنے کا خاموش اشارہ کر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر نوجوان کی کسمساہٹ اور پھر یکا یک دوسری طرف دیکھنے کا بہانہ کرنا رائے صاحب کی تجربہ کار نگاہوں سے چھپا نہ رہ سکا۔

انھوں نے اسکوٹر گھر کی طرف موڑ دی۔

''کیوں داؤ جی، کیا ہوا؟'' انجنا نے مشکوک لہجے میں پوچھا۔ غصّے کے مارے رائے صاحب کے منہ سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔ اس لڑکی کی خاطر انھوں نے اپنے خاندان کی روایت توڑی، پڑھنے بھیجا اور اس نے ان کے خاندان پر کیچڑ اُچھالنے کی کوشش کی۔ اچھا ہوا، وقت پر بات کھل گئی اور وہ بھی کسی شور شرابے کے بغیر۔ اگر بات بڑھ جاتی تو وہ کہیں کے نہ رہتے۔ اپنے غصّے پر قابو پاتے ہوئے وہ دبی آواز میں انجنا سے بولے، ''کچھ ضروری کام یاد آ گیا ہے، اس لیے اب دوسرے دن کروں گا کچہری کا کام۔''

''تو میں پیدل ہی چلی جاؤں یہاں سے کالج؟'' انجنا نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''نہیں....'' ان کی آواز کرخت اور لہجہ سخت تھا۔

انجنا سمجھ گئی کہ چپ کرانے کے اشارے نے داؤ جی کے سامنے سارا بھید کھول دیا ہے۔ شرمندگی اور خوف کا ملا جلا احساس چٹان بن کر اس کے حواس پر آ گرا تھا۔ وہ کیسے گھر میں سب کو منہ دِکھائے گی۔ داؤ جی کم سے کم اماں کو تو ضرور بتا دیں گے۔ اماں کی چھیدتی ہوئی نگاہ کا سامنا وہ کیسے کرے گی؟ ہے بھگوان ..... اسکوٹر پر بیٹھے بیٹھے اس نے پیچھے مڑ کر پلیا کی طرف دیکھا۔ دیوراج کھڑا ہو کر اسی کو دیکھ رہا تھا۔ خوف اور بے چارگی کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ عجیب ہوتا ہے محبت، خوف اور ندامت کا یہ مثلث۔ بغیر کسی انجام کے ایک دوسرے سے مربوط تینوں زاویوں کا اتصال الگ الگ۔

روایت نے موقع دیکھ کر ترقی پسندی کے پاؤں پر کلھاڑی ماری تھی۔ انجنا کی پڑھائی بیچ

میں روک دی گئی۔ بلا تاخیر دور کے رشتے میں شادی طے ہوگئی۔ گاؤں میں سب کو بتا دیا گیا کہ انجنا کے سسرال والے نہیں چاہتے کہ ان کی ہونے والی بہو اتنی دور پڑھنے کے لیے جائے۔ شادی ہوجانے کے بعد امتحان دلا دیا جائے گا۔ اس کے آگے کی پڑھائی انجنا بدائی کے بعد اپنی سسرال سے کرے گی۔

شادی کے بعد انجنا جب پہلا پرچہ دینے جارہی تھی تو اس کی نگاہوں نے پُلیا کے اطراف کا خاموشی کے ساتھ جائزہ لیا۔ دیوراج کی ایک جھلک بھی دِکھائی نہ دی۔ وہ لمبی سانس لے کر رہ گئی۔ شادی کے تین چار مہینے بعد وہ کالج کے لیے نکلی تھی۔ اتنے دنوں میں تو نہ جانے کتنی بار دیوراج آ کر پُلیا پر بیٹھا ہوگا اور مایوس ہوکر چلا گیا ہوگا۔ اس نے چپکے سے ایک خط پپو کو ڈاک خانے میں ڈالنے کے لیے دیا۔ اس میں رو رو کر اپنا حال اور شادی کر لینے کی مجبوری بیان کی تھی۔ دیوراج کو کتنا صدمہ ہوا ہوگا۔ اسے بے وفا سمجھ رہا ہوگا۔ امتحان کے پہلے ہی دن ایک انتر دیشی لفافہ دوبارہ لکھ کر کالج کے چپراسی کو ڈاک خانے میں ڈالنے کے لیے دیا۔ بھیّا اسکوٹر پر لے کے آتے تھے امتحان دلانے۔ تین گھنٹے کا وقت اِدھر اُدھر بیٹھ کر یا گنگا پار شہر جا کر گزارتے تھے۔ گھر کی چار دیواری سے باہر آتے ہی انجنا کے سارے جذبات بیدار ہوگئے تھے۔ کالج کے دنوں میں وہ اکثر خالی پیریڈ میں لائبریری میں بیٹھ کر رسائل و جرائد کے اوراق پلٹتی رہتی تھی۔ آزادیِ نسواں کی تحریک اور ترقی پسندی کے خیالات و نظریات سے وہ متعارف ہونے لگی تھی۔ کبھی کبھی کسی رسالے میں چھپی ہوئی کہانی یا مضمون میں کھلے کھلے لفظوں میں جنسی جذبات کے بارے میں پڑھ کر اس کی کنپٹیاں جلنے لگتیں۔ کئی دنوں تک لفظ تصویر بن کر من میں تاک جھانک کرتے رہتے۔ وہ بھی آزادی کے نام پر وہ سب کچھ چاہتی تھی۔ جسم کی آزادی کا نعرہ اس کی رگوں کو بھی چٹختا رہتا لیکن روایتیں بیڑیوں کی طرح جکڑے رہتیں۔

اس کا دوسرا خط پا کر جب دیوراج اس سے ملنے کالج پہنچ گیا تو اس نے بیڑیوں کو ایک جھٹکے میں توڑ ڈالا۔ اسے بھی فیصلہ کرنے کا اختیار ہے۔ وہ گائے بیل تو ہے نہیں جسے کسی بھی کھونٹی سے باندھ دیا جائے۔ ہر معاملے میں مرد ہی کی بالادستی کیوں؟ عورت کا اپنا علیحدہ وجود ہے۔ وہ

آزاد ہے۔ آزادی کی تمنا اس کی نس نس سے پھوٹ رہی تھی اور وہ چپکے سے امتحان ختم ہونے سے پہلے ہی نیا امتحان دینے کے لیے دیوراج کے ساتھ بھاگ نکلی۔ سہیلیوں اور ٹیچروں نے سمجھا کہ نئی نئی شادی کے بعد دلھن سے ملنے کی چاہ میں اس کا شوہر آیا ہے۔ جب امتحان ختم ہونے کے کافی دیر بعد بھی انجنا باہر نہیں نکلی تو اس کا بھائی اس کے بارے میں جانکاری حاصل کرنے کے لیے پرنسپل کے آفس میں گیا تو اسے یہی بات بتائی گئی۔

''آ جائے گی گھر۔ جھجک کی وجہ سے اس نے کچھ بتایا نہیں ہوگا۔'' ایک ٹیچر نے ہنستے ہوئے سمجھایا تھا۔

''بدائی والی شادی میں اسی طرح کی بے چینی ہوتی ہے۔ اب لڑکا لڑکی مچیور ہیں تو انھیں الگ الگ رکھنا ہی نہیں چاہیے۔ رخصت کر کے اپنا پنڈ چھڑا لینا چاہیے۔'' دوسرے ٹیچر کا پُر مذاق لہجہ انجنا کے بھائی کو چبھنے لگا تھا۔ اس کی گھبراہٹ بڑھ گئی تھی۔ اگر انجنا گھر نہ پہنچی تو؟ پتہ نہیں سچ مچ اس کا شوہر آیا تھا یا کوئی اور؟ پتا جی کو جا کر وہ کیا بتائے گا؟

کرائے کے کمرے میں دیوراج کے ساتھ رہتے ہوئے ان بیس دنوں میں ہزاروں بار انجنا کو اپنے گھر اور سسرال کے لوگ یاد آئے تھے۔ داؤجی اور اماں کی حالت کے بارے میں سوچ سوچ کر اس کی آنکھیں بھر آتی تھیں۔ پاس پڑوس والوں کو کیسے منہ دِکھا پاتے ہوں گے؟ سسرال والے اسے کیسے کیسے الزامات دے رہے ہوں گے؟ دیوراج سمجھاتا کہ کورٹ میرج کر لینے کے بعد سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ دنوں بعد وہ لوگ بھی قبول کر لیں گے۔ اپنی اولاد سے کوئی دشمنی تھوڑے ہی رکھتا ہے۔

لیکن جب دیوراج کو پتہ چلا کہ اس کا نام اور پتہ معلوم کر کے اس کے نام سے پولس میں رپورٹ درج کرائی گئی ہے اور پیسے لے کر پولس جاسوس کتے کی طرح دیوراج نام کے چور کو تلاش کر رہی ہے تو اس کے اندر موجود محبت کے جذبات کا سوتا خشک ہونے لگا۔ انجنا اب اسے ایک روکھی پھیکی کھردری چٹان سی لگنے لگی جسے گلے میں باندھے باندھے وہ بھی ڈوب جائے گا۔ اس نے گلے کا بندھن ڈھیلا کرنا چاہا۔ اُمڈتی ہوئی گنگا میں اس چٹان کے جل سمادھی لینے کی پہلے تو کسی کو خبر

ہی نہیں ہوگی اور اگر دور کہیں کسی کنارے مل بھی گئی تو اس سے کیا واسطہ؟ اس کے گھر والے جانیں۔

سویرے اخباروں کی چٹ پٹی خبر بن گئی تھی انجنا کی پریم کہانی۔ پریمی نہیں جانتا تھا کہ عورت صرف فیصلہ کرنا نہیں جانتی بلکہ تیرنا بھی جانتی ہے۔ صبح کے اندھیرے میں پل پر سے زبردستی گنگا کی لہروں پر اُچھالی گئی انجنا موت کو دھکا دیتے ہوئے نہ جانے کتنی دور تک لے آئی تھی۔ کچھ ملاحوں نے زندگی کو لہروں کے ساتھ دو دو ہاتھ کرتے ہوئے دیکھا۔ موجوں کی گرفت سے اسے نکال کر کنارے لایا گیا تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ جان کے سوا باقی تمام لباس نے گنگا کی لہروں میں ہی ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ ملاحوں نے کسی چادر کا انتظام کر کے اس کے جسم کو ڈھانکا، اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ جب اسے ہوش آیا تو سچ بولنے کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ دنادن میڈیا کے فلیش چمکنے لگے۔ خبر نویسوں کے لیے اچھا مسالہ تھا۔ اخبار کی فروخت کچھ تو بڑھے گی۔ کچھ نے پریمی کو کوسا، کچھ نے ماں باپ کی دقیانوسی سوچ کو۔ بڑی بوڑھی عورتوں نے تو انجنا کے منہ پر ہی طعنوں کی بوچھار کردی —— ماں باپ کی ناک کٹا دی .... مر ہی گئی ہوتی تو اچھا ہوتا .... کون سا منہ لے کر جائے گی گھر یا سسرال .... دو حرف پڑھ لکھ جانے پر عزت آبرو کا دھیان ہی نہیں رہتا لڑکیوں کو .... ارے سب ایسے ہی تھوڑی ہوتی ہیں، اپنی شکلائن کی لڑکی کو دیکھو، آنکھ نیچے کیے جاتی ہے اور آنکھ نیچے کیے ہی آتی ہے۔ کیا مجال جو آج تک کسی نے ایک اُنگلی اُٹھائی ہو اس کی طرف، گائے ہے گائے۔

انجنا اندر ہی اندر بے چین ہے۔ ان بیس دنوں کی جسمانی آزادی یا عورت کی آزادی کے بوجھ کو کس طرح ڈھوئے؟ انجنا کی کہانی کا خاتمہ بھی بے قرار ہے۔ ادب کے مثلث نقطۂ نظر سے کیا اختتام ہونا چاہیے؟ ترقی پسندی نے تو منجھدار میں چھوڑ دیا۔ تانیثی فکر نے ہاتھ پیر چلانے کی طاقت دی لیکن کنارے پر لا کر اس طرح پٹک دیا کہ وہ کہیں کی نہ رہی۔ کیا وہ دوبارہ روایت پرستی کی چوکھٹ پر جائے؟ ترقی پسندی، روایت پرستی اور تانیثیت تینوں نقطۂ نظر سے اس کہانی کو الگ الگ لکھنے کے بعد بھی اختتام بس اسی ایک حقیقت پر آ کر رُک جاتا ہے کہ انجنا اب کیا کرے؟

* * *

ابھی ٹھہرو اندھی صدی!

''میں نہیں جاؤں گی یہ پہن کر.....''

سیچنی چولی کا نچلا بٹن بند کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ٹھنکی تھی۔ ہرے رنگ کی تنگ شلوار کی کمر میں بندھی ہوئی ڈوری نیچے لٹک رہی تھی۔ گھٹنوں پر شلوار تیل اور میل سے چکٹ ہوگئی تھی اور اس کا رنگ مٹ میلا ہوگیا تھا۔

''کیوں نئیں جائے گی؟'' نیم کی تیلی کو دانتوں سے کچلتے ہوئے مَڑھی (سوکھی گھاس پھوس کی بنی ہوئی جھونپڑی) کے ایک کونے میں بیٹھی ہوئی سیچنی کی ماں پرکلیا غضبناک ہوکر بولی۔

''یہ چولی میں جو ٹھور جیسا نکلا ہے وہ مجھے اچھا نہیں لگتا۔'' سیچنی نے چولی کے سامنے والے اُبھرے ہوئے دونوں حصوں کو اپنے ہاتھوں کی اُنگلیوں سے پکڑ کر نوچتے ہوئے کہا۔ پرکلیا نے سیچنی کی طرف دیکھا اور زور سے ہنس پڑی۔

''پگلی کہیں کی۔ ابھی تیرے چھاتی نہیں ہے نا، اسی لیے۔ نئیں تو اس طرح کی چولی تو بڑے گھر کی ہی عورتیں پہنتی ہیں۔ پردھانن نے دی تھی۔ مجھے کستی ہے، نئیں تو میں ہی پہنتی۔ تو ہی پہن لے اسے۔ کم سے کم کچھ تن تو دھوپ سے بچے گا۔''

پرکلیا پھر پتوں کی تیلیوں سے جوڑ کر پتّل (پتوں کی رکابیاں) بنانے میں مصروف ہوگئی۔

''نہیں، میں ایسے ہی چلی جاؤں گی۔ اس دن جوکھن چمار کے کھیت میں گیہوں بٹور رہی

تھی تو اس کا بڑا والا بیٹوا پُرسا میرے پاس آیا تھا اور اسے نوچ کر ہنستے ہوئے چلا گیا تھا۔" سیچنی دوبارہ ٹھنکنے لگی تھی۔

پرکلیا چونک پڑی۔

"کاہے ناہیں اس کے منہ پر کھینچ کر ماری ایک جھانپڑ، مردار کہیں کی۔ کل کو تو سیانی ہوگی تب بھی اس کی یہی ہمت رہے گی۔ ای مسخری کاہے ناہیں اپنی مائی بہن سے کیا؟ ہم مُسہری ہیں تو کیا، ہماری کوئی مرجاد نئیں ہے؟ اب ای جمانہ آ گیا کی اؤ لوگ بھی دوسرے کی بٹیا بہوریا پر نگاہ ڈالنے لگے؟"

پرکلیا غصّے میں اُٹھ کر سیچنی کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی اور اس کے سینے کی طرف دھیان سے دیکھنے لگی، گویا پُرسا کی منشا ڈھونڈ رہی ہو خالی چولی کے اندر۔

گلابی رنگ کی پرانی چولی اور شلوار کے بیچ سانولی سڑک کی طرح سیچنی کا کھلا پیٹ دِکھائی دے رہا تھا۔ پرکلیا نے سیچنی کو نیچے سے اوپر تک دیکھا۔ روکھے سوکھے، اُلجھے سے بھورے بالوں کی دس پندرہ لٹیں سیچنی کی گردن پر آگے پیچھے جھول رہی تھیں۔ گلے پر میل کی موٹی تہہ پسینے سے پھول کر جم گئی تھی۔ ہونٹوں کی سوکھی پپڑی کو دیکھ کر شاید ناک کے اندر کی نمی کو شرم آ گئی تھی اور اس نے خود کے لیے ناک کے دروازے پر پردے تان دیے تھے۔

چولی کے گلے کو ہاتھوں سے آگے کی طرف کھینچ کر پرکلیا نے اندر جھانکا۔ ہلکے ہلکے اُبھاروں کو دیکھ کر اس کا غصہ بھڑک اُٹھا۔ اس نے چولی کا گلا چھوڑ دیا اور ایک زناٹے دار تھپڑ سیچنی کے سوکھے گال پر دے مارا۔

"حرامجادی کہیں کی .... بارہ برس کی ہونے جا رہی ہے اور اپنے جسم کی سدھ بھی نئیں ہے۔ تجھ سے جادہ سپھائی سے تو میری سُوَریا رہتی ہے۔ کم سے کم پونچھ ہلا کر ساپھ تو کر لیتی ہے۔ ایک تو ہے، اپنا ہاتھ منہ بھی دھو نہیں پاتی۔ دیس بھر کا اِلت بٹورے ہے۔"

پرکلیا، سیچنی کے بالوں کو مٹھی میں پکڑتے ہوئے دوبارہ بولی، "جا، سرکاری نلکے پر کاندے سے ہاتھ منہ دھو اور ڈھلہیا کنگھی سے ای اپنا جٹا جوٹ جھاڑ لے۔.....اور آج سے کہیں بھی جانا تو

جگنا کو اپنے ساتھ رکھنا۔“

پرکلیا کی آواز تھوڑی سی نرم ہوگئی۔ سچنی، ماں کے اس اُتار چڑھاؤ کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ ماں کی آواز کو نرم ہوتے دیکھ کر وہ دھیرے سے پوچھ بیٹھی، ”مائی، اؤ کیتھانے میں رام سمیر لالہ کے جھنکے لَڑِکا کا بیاہ ہے آج، پرچھن ہونے جا رہا ہے ڈیہہ بابا کے یہاں۔ پیسہ لؤٹنے جاؤں؟“

اسی وقت جگنا دوڑتا ہوا آیا۔ چار خانے والی پھٹی جانگھیا اس کے گھٹنوں کے نیچے تک لہرا رہی تھی۔ اوپر سے پورا ننگ دھڑنگ عمر کوئی آٹھ نو سال۔

”مائی..... مائی.....“ وہ کچھ بتانے کی بیتابی میں ہانپنے لگا تھا۔

”کیا ہے رے؟ کچھ بکے گا بھی یا بس مائی.... مائی....“

’مائی، اؤ رام سمیر کَکّا کے لڑکا کے بیاہ میں سُلیما (سنیما) بنانے والے آئے ہیں۔“

”تو ای کون سی نئی بات بتا رہا ہے رے! آج کل تو سبھی کے بیاہ میں ہوتا ہے۔ پردھانن کے لڑکی کے بیاہ میں جب ہم پتَّل پہنچانے گئے تھے تو ہمارا اور تمھارے باؤ کا سجّ فوٹو چلتے پھرتے آیا تھا۔ ہئی پنروا اؤسَے گودی میں تھا۔ بھل ٹُکر ٹُکر وہی میں تاک رہا تھا۔“ پرکلیا کی خوشی چہرے سے چھلک رہی تھی۔

”مائی، ہم کو کاہے ناہیں لے گئی تھی....؟“ جگنا کے لہجے میں ناراضگی تھی۔

”ارے، کیا پتہ تھا کی ای سب ہوگا۔ ہم تو پتّل پہنچا کر اور پروسا لے کر آ گئے تھے۔ اؤ تو بہت دن بعد جب پردھانن کے کھیت میں آلؤ کھودے گئے تو پردھانن نے بلا کے دِکھائی۔“

”لیکن مائی، رام سمیر ککّا کے ہاں سرکاری لوگ آئے ہیں۔ وہی لوگ سُلیما بنائیں گے اور سرکار کو اور سب کو، پوری دنیا کو دِکھائیں گے۔“ جگنا نے حیرت کے جذبے سے دنیا بنانے کی کوشش میں اپنے دونوں ہاتھوں کو ہوا میں دور تک لہرایا تھا۔

”اچھا چل، دنیا کو دکھاویں یا جہان کو۔ ہمیں اس سے کیا؟ سچنی کو بھی ساتھ لے لے اور ڈیہہ بابا تر پہنچ جا۔ بارات پرچھن کے لیے پہنچ رہی ہوگی۔ دیکھ، باجا سنائی پڑ رہا ہے۔ چالاکی سے پیسہ لؤٹنا۔ یہ نہیں کی بدھو کی طرح کھڑے رہو سنیما والوں کو دیکھنے کے پھیر میں اور دوسرے

لڑ کے سارا پیسہ لوٹ لیں۔'' پرکلیا نے سیجنی اور جگنا کو ہدایت دی اور مڑھی کے اندر کچھ لینے کے لیے چلی گئی۔

''لے، یہ گمچھا سامنے سے اوڑھ لے سیجنی۔'' پرکلیا نے ایک میلا سا گمچھا سیجنی کی طرف اُچھال دیا۔

سیجنی نے گمچھا لپک لیا اور اس کا ایک سرا اپنے دائیں کندھے پر سے سامنے کی طرف پھیلاتے ہوئے دوسرے سرے کو کمر کے چاروں طرف کس کر لپیٹ دیا۔ دونوں اُبھار ڈھک گئے تھے۔

''آ کر منہ ہاتھ دھو لینا اور ہاں، جگنا.... آتے سمے اسکول پر جو مہوا کا پیڑ ہے اس کی پاتی کا ایک گٹھر لیتے آنا۔'' پرکلیا نے ہدایت دی۔

''مائی، باؤ بھی آ گئے۔ پنارؤ کو دیکھ لیں گے۔ تو' بھی چل نہ ہمارے ساتھ۔''

''ارے وہ ایک سیرے سے کوڑانے گئے تھے۔ کل ساہب راج کوڑی کا کنّا کھودا گیا ہے۔ کبھی کبھی موٹے موٹے کنّے ماٹی میں دبے چھوٹ جاتے ہیں۔ کل سری کی مہرارؤ جھوّا بھر چھرّی آلو کنھئی کے کھیت سے بین کر لائی تھی۔ مجھے دیکھی تو اس پر لُگری پھیلا دی کی کہیں نظر نہ لگ جائے۔ اسی لیے آج تڑکے ہی میں نے تیرے باؤ کو ساہب راج کے کھیت میں بھیج دیا۔ کہیں وہ مردار پہلے ہی پہنچ جاتی تو کچھ نہ ہاتھ لگتا..... کچھ ملا پنارؤ کے باؤ؟'' پرکلیا نے اپنے شوہر نتھئی کی طرف سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔ نتھئی نے پلاسٹک کی بوری کو جھونپڑی کے کونے میں ٹکاتے ہوئے کہا، ''ہاں، دو جؤن کا خوراکی مزے میں ہو جائے گا۔'' نتھئی کے چہرے پر اطمینان کی جھلک دِکھائی دے رہی تھی۔

''چلو نا مائی....'' جگنا نے دوبارہ ضد کی۔

''نئیں، تم دونوں جاؤ۔ دوپہریا ہو گئی ہے۔ تمھارے باؤ کُلّا داتؤن کچھ نہیں کیے ہیں۔ پھر پنارؤ کو بھی نہ جانے کب کیا جرؤرت لگے۔ ابھی تو سویا ہے۔''

''کیوں بھیج رہی ہو؟ کہیں پیسہ لؤٹنے میں چوٹ چپیٹ لگ جائے تو ایک کو اور لے کر

جِنگی بھر بھوگیں۔ ارے، سادی بیاہ میں لوگ کتنا پیسہ لٹائیں گے؟ دس بیس روپے کا دس دس یا پانچ پانچ پیسہ کرا کر دولھے کا پرچھن کر کے لٹاتے ہیں لوگ اور لوٹنے والے کم سے کم تیس چالیس بچے۔ کتنا ملے گا کسی کو؟''

''ارے، بیڑی سلائی بھر کا بھی لئوٹ لیں گے تو کیا ہرج ہے۔ سلائی کتنے دن سے ختم ہے۔ روج سنٹھا کا لُگّا نہڑی بؤ کے چولھے سے بار کر لاتی ہوں تو اپنا چولھا جلتا ہے۔'' پرکلیا نے دلیل دی۔ نتھئی چپ ہوگیا۔ کھانے کا انتظام تو کہیں نہ کہیں سے بین بٹور کر ہو جاتا تھا لیکن کسی کھیت میں پیسے تو نہیں اُگتے نہ ہی مٹی میں دبے ملتے ہیں جس سے وہ کوئی سودا خرید سکیں۔ بات کو بدلتی ہوئی پرکلیا بولی، ''دیکھ جگنا، مہوا پر بہوت اُپر نہ چڑھنا۔ نیچے سے ہی پتے توڑ لینا۔ تاڑ سا ہو گیا ہے مہوا۔''

☆

بارات پرچھن کے لیے گاؤں سے باہر ڈیہہ بابا کے یہاں پہنچنے ہی والی تھی۔ چالیس پچاس چھوٹے بڑے، ننگ دھڑنگ، ناک بہاتے پونچھتے بچوں کی بھیڑ پہلے ہی سے ڈیہہ بابا کے یہاں پہنچ چکی تھی۔ کچھ تو پرچھن میں دولھے پر سے نچھاور کیے جانے والے پیسوں کے لیے اور کچھ ٹی وی کی کیمرہ ٹیم کو دیکھنے کے لیے۔ پروگرام آفیسر کملنی سنہا اپنے پروڈکشن اسسٹنٹ، کیمرہ مین اور لائٹ مین کے ساتھ شاٹ لینے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ ان سب کے چہرے پر اپنی محنت کی کامیابی کی اُمنگ نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنے اس پروگرام کے تعلق سے کافی پرجوش تھے۔ چونکہ یہ ان کا اپنا گاؤں تھا اس لیے انھیں یہاں شوٹنگ کرنے میں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ گاؤں کی اس ہونہار بیٹی کے ساتھ سب لوگ بڑھ چڑھ کر تعاون کر رہے تھے۔ سب کے دلوں میں ایک دبی ہوئی خواہش تھی کہ شاید اسی بہانے سے ان کا چہرہ بھی ٹی وی پر دِکھائی دے جائے۔

''میڈم، بہت ہی انٹریسٹنگ پروگرام بنے گا یہ۔'' کیمرہ مین مسٹر جاوید نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔

''ہوں۔''، کملنی نے مختصر سا جواب دیا۔ جاوید کے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے ایک خاتون

افسر سے بات کرنے کی بدتمیزی سے کملنی کھسیا گئی تھی لیکن وہ اپنی کھسیاہٹ کو ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ اس سے پروگرام پر اثر پڑ سکتا تھا۔ الیکٹرونک میڈیا اور وہ بھی ٹی وی میں کسی کو ناراض کر کے کامیاب پروگرام پیش نہیں کیا جا سکتا۔

''اگر کمیٹی والوں نے اس فیچر کو ذرا توجہ سے دیکھ سن لیا تو اس سال کا پہلا پرائز میڈم کو ملنا ہی ملنا ہے۔'' لائٹ مین مسٹر کپوریا نے اُچک کر آم کی ایک پتی کو توڑتے ہوئے کہا۔

''اگر آپ سب کا تعاون نہ ہوتو بھلا یہ پروگرام بن سکتا ہے؟ اس لیے اگر پرائز ملے بھی تو اس کا کریڈٹ صرف میڈم کو نہیں ملنا چاہیے۔'' کملنی آم کے پیڑ کی اُبھری ہوئی موٹی جڑ پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''اے لڑکے ..... کیمرہ کیوں چھوٗ رہا ہے؟'' جاوید نے کیمرے کے پاس کھڑے ہوئے لڑکے کو جھڑکا۔

کملنی نے دیکھا کہ ایک ننگ دھڑنگ لڑکا جو گھٹنے تک چار خانے والی پھٹی جانگھیا پہنے کیمرے کو تجسّس سے سہلا رہا تھا۔ جاوید کی ڈپٹ سے سہم کر اس نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ اس کے بغل میں کھڑی ایک بارہ تیرہ برس کی لڑکی اسے کندھوں سے جھنجھوڑتے ہوئے پھسپھسا کر کہہ رہی تھی، ''اے ..... جگنا ..... چل، آج تجھے مائی سے ضرور پٹواؤں گی۔ بہت من بڑھئی کرتا ہے تو۔''

اور وہ لڑکی جگنا کو کھینچتے ہوئے بچوں کے جھنڈ کی طرف چلی گئی۔ بارات قریب آ گئی تھی۔

''یہ اس گاؤں کی کلپنا چاؤلہ ہے۔'' کپوریا لڑکی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ہنسا۔

''اسی لیے تو میں نے یہ ٹاپک چنا ہے 'اکیسویں صدی کی دستک'۔ ایک طرف تو ہم اکیسویں صدی میں جانے کے لیے بالکل تیار ہیں، لڑکیاں خلا میں پہنچ رہی ہیں، پائلٹ بن رہی ہیں، خواہشات کی اونچی اونچی اُڑان ہے تو دوسری طرف تالاب کے ٹھہرے ہوئے پانی جیسی یہ زندگی۔'' کملنی جذباتی ہوگئی تھی۔

''ایک شاٹ اس لڑکی کا بھی لے لوں میڈم .....؟ بعد میں آپ اس سے انٹرویو کر لیجیے گا۔'' کپوریا نے تجویز پیش کی۔

کرداروں کی زبان، ان کے ماحول اور شخصیت کی عکاسی کرتی ہے۔ کہانیوں میں واقعات بالکل فطری انداز سے سامنے آتے ہیں۔

مجموعہ ترتیب دیتے وقت انتخاب کا مرحلہ بڑا کٹھن تھا۔ اس مرحلے پر میرے بزرگ دوست، مشہور ماہر تعلیم **محمد حسن فاروقی** صاحب نے مدد فرمائی اور از راہِ عنایت کہانیوں کے انتخاب اور ترتیب کی ذمہ داری اپنے سر لے لی۔ اس تعاون کے لیے میں ان کا جتنا شکریہ ادا کروں کم ہے۔ ترجمہ کرنے کے بعد میں نے ساری کہانیاں اپنے عزیز دوست اور مشہور و معروف افسانہ و انشائیہ نگار **مشتاق رضا** صاحب کو دِکھائیں۔ انھوں نے ترجمے کی زبان و بیان کے سلسلے میں مفید مشورے دیے۔ اگر میں ان کا شکریہ ادا نہ کروں تو سخت ناسپاسی ہوگی۔ میں **ڈاکٹر نیرجا مادھو جی** کا خاص طور پر شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے بڑے خلوص سے اپنی کہانیوں کا ترجمہ کرنے اور انھیں کتابی شکل میں شائع کرنے کی اجازت دی۔

ملک کے مشہور و معروف افسانہ نگار سلام **بن رزّاق** صاحب کا تہہ دل سے ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے اپنی بے پناہ مصروفیات کے باوجود میری درخواست پر ڈاکٹر نیرجا مادھو، ان کی کہانیوں اور مترجم کے بارے میں انتہائی جامع انداز میں اپنے خیالات کو قلمبند فرمایا۔ میں دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں **ڈاکٹر الکا پوتدار** صاحبہ (ہندی افسر، بال بھارتی، پونہ) کا جنھوں نے از راہِ نوازش مصنفہ اور مترجم کے بارے میں اپنے تاثرات کو انتہائی خوبصورتی سے چند سطور میں قلمبند کر دیا ہے۔ ہندی سے اُردو میں ترجمہ کرنے میں موصوفہ نے ہمیشہ میری مدد فرمائی ہے۔ میں **مشتاق مدنی صاحب** اور **مولوی سیّد آصف صاحب** کا بھی بے حد شکرگزار ہوں جن کے تعاون کے بغیر یہ کتاب اتنی خوبصورت اور اتنے کم وقت میں چھپ نہیں سکتی تھی۔ میں شکرگزار ہوں **قومی کونسل برائے فروغ اُردو زبان، نئی دہلی** کے ذمہ داران کا جس کے جزوی مالی تعاون سے یہ کتاب اشاعت پذیر ہوئی ہے۔

غلام نبی مومن

''ابھی نہیں۔ وہ دیکھیے، دولھے کی کار آ گئی ہے۔ پہلے اس کے لیے تیار ہو جائیے۔'' کملنی نے سامنے کی طرف اشارہ کیا۔

''مڈ شاٹ لو....، وہ عورت اور یہ کسٹم، سب کو کور کرنا ہے۔'' کملنی نے اسی طرف دیکھتے ہوئے ہدایت دی۔

''چھن ..... چھنن ..... چھنن ..... چھناک .....'' پرچھن کرنے والی خاتون نے مٹھی میں ریزگاری بھر کر دولھے پر سے اُتار کر اوپر کی طرف اُچھالا تھا۔ بچے ایک دوسرے پر گرے پڑ رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے کہرام سا مچ گیا۔

''اٹینشن ..... لانگ شاٹ ..... پیسہ لوٹتی ہوئی بچوں کی یہ بھیڑ آنی چاہیے۔'' کملنی اسی سمت میں دیکھتے ہوئے گویا کمنٹری کر رہی تھی۔

''چھن ..... چھنن ..... چھنن ..... چھناک .....'' اس بار کار کی چھت سے پیسے ٹکرا کے نیچے گرے تھے۔ کچھ پیسے کار کی چھت پر ہی رہ گئے تھے۔ دو تین بچے اس پر چڑھنے کی کوشش کر رہے تھے تب تک سیچنی پیچھے کار کی ڈِگّی پر چڑھ کر پیسے بٹورنے کی کوشش کر رہی تھی کہ ایک مردانہ ہاتھ لپکا اور سیچنی کو بالوں سے پکڑ کر کھینچ لیا۔ ''شیشے وِیشے توڑ ڈالے گی کیا پیسے لوٹنے کے چکر میں۔ ماریں گے ایک پٹا کا ..... ہوش پینترے ہو جائے گا۔'' مردانہ آواز گونجی۔ سیچنی سہم کر جھنڈ سے الگ جا کھڑی ہوئی۔

''کیمرہ ..... اس طرف مسٹر جاوید۔ فوکس آن ہر فیس۔'' کملنی نے سیچنی کی طرف اشارہ کیا۔ سیچنی ان سب سے بے تعلق اپنے لوٹے ہوئے پیسوں کو ہتھیلی پر پھیلا کر گن رہی تھی۔

''صرف ہتھیلیاں .....'' کملنی نے مزید ہدایت دی۔ وہ کوئی بھی شاٹ چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ ڈبنگ، ایڈیٹنگ یا مکسنگ میں نہ جانے کون سا چھوٹا شاٹ بھی بہت معرکے کا اور اہم ہو جائے۔

''کٹ .....'' کہتے ہوئے کملنی سیچنی کی طرف بڑھی تھی۔ پرچھن ختم ہو چکا تھا۔ کار دھول اُڑاتی چلی گئی۔ عورتوں اور بچوں کا جھنڈ گاؤں کی طرف واپس جا رہا تھا۔ عورتوں کے گانے کی

آواز سے ماحول بھی گونج رہا تھا —— ''سونے کی تھاری میں جیونا پروسوں ....''

''کیا نام ہے تمھارا؟'' کملنی سچنی کے پاس پہنچ چکی تھی۔ سچنی نے خوف اور حیرت کے ملے جلے جذبے سے کملنی کو اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ اس کے ہونٹ سختی سے بند تھے۔

''بٹیا، کیا نام ہے تمھارا؟'' پوچھتے ہوئے کملنی نے شاٹ لینے کے لیے کیمرہ مین کو اُنگلیوں سے اشارہ کیا۔

''سچنی....'' نام بتاتے وقت اسے اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس ہوا تھا۔

''پتا جی کا کیا نام ہے؟''

''..........'' سچنی کچھ جواب دیے بغیر یک ٹک کملنی کا منہ دیکھے جا رہی تھی۔

''کس کی لڑکی ہو تم؟'' کملنی نے اپنی آواز میں اور مٹھاس گھولنے کی کوشش کی۔

''نتھئی مسہر کی۔'' سچنی گویا کسی خواب میں ڈوبی ہوئی بول رہی تھی۔ اتنے اچھے کپڑے پہنی ہوئی ایک پڑھی لکھی میم صاحب اس سے بات کر رہی تھی۔

''یہ ..... مُسہر لگانا ضروری ہے کیا؟'' کملنی خود سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ یہ سوال وہ سچنی سے کر رہی تھی یا اپنے آپ سے۔

سچنی صرف مسکرا کر رہ گئی۔

''گھر میں اور کون ہیں؟'' کملنی نے سوال بدل دیا۔

''مائی ہے ..... باؤ ہے .... پنروا اور چھوٹکی۔'' سچنی نے ٹکڑے ٹکڑے میں بتایا تھا۔

''یہ کون ہے؟'' سچنی کے پیچھے منہ چھپائے کھڑے ہوئے جگنا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کملنی نے پوچھا۔

''ای .....ای .....جگنا ہے۔ ہمارا بھائی۔'' سچنی دھیرے دھیرے کھل رہی تھی۔

''تمھارا گھر کدھر ہے؟''

''اؤ سامنے ہی تو ہے مسہران۔'' سچنی نے اُنگلی اُٹھا کر سامنے کی طرف اشارہ کیا۔ تقریباً دس پندرہ فرلانگ کی دوری پر پیڑوں کے جھرمٹ میں، مٹی کی دیوار اور چھپّر کی چھت والی دس بارہ

جھونپڑیاں تھیں۔

کملنی کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ ایک طرف اعلیٰ تعلیم یافتہ، خود کفیل خواتین سے انٹرویو اور دوسری طرف اَن پڑھ اور انتہائی تکلیف میں زندگی بسر کرنے والی عورتوں کے خیالات۔ بہت ہی خوبصورت بن جائے گا پروگرام۔ کملنی نے کیمرہ ٹیم کو گاؤں کی طرف چلنے کا اشارہ کیا۔

''لیٹ اَس گو۔ وی وِل شوٹ دیئر..... ہم تمھارے گھر چلیں سجنی؟'' کملنی نے اپنائیت سے سجنی کے کندھے پر ہاتھ رکھا تھا۔

''ہؤں....'' سجنی خوش ہوگئی۔ جگنا سنتے ہی اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنی ڈھیلی جانگھیا کو سنبھالتے ہوئے گھر کی طرف سرپٹ دوڑ پڑا۔ شاید اپنی ماں کو بتانے۔

☆

سجنی کے دروازے پر پہنچتے ہی گوبر، مٹی وغیرہ کی سڑاند نے کملنی اور اس کی ٹیم کا سواگت کیا۔

''اوہ میڈم، ویرّی ہَیوکم؟'' کپوریا نے ناک پر رومال رکھتے ہوئے کہا۔

''اِن سیٹنس ایمپائرَ'' جاوید نے ایک ہاتھ ناک پر رکھتے ہوئے دوسرے ہاتھ سے کیمرے کو سجنی کی جھونپڑی کے دروازے سے ٹکاتے ہوئے کہا۔

''پلیز....'' کملنی کی آواز میں تلخی کے ساتھ ہدایت بھی پوشیدہ تھی۔

تھئی دوڑ کر بانس کی پتلی ڈنڈیوں سے بنی ہوئی تین اونچی کھانچی کو اُلٹ کر ان کے بیٹھنے کا انتظام کرنے لگا۔ آخر شہر کے لوگ اور وہ بھی ٹی وی والے اس کے دروازے پر آئے تھے۔ سواگت تو کرنا ہی تھا۔ اپنی چارپائی پر بٹھانا تو ان کی بے عزتی کرنا تھی اس لیے کھانچی کو اُلٹ کر اس سے کرسی کا کام لیا جاسکتا تھا۔

''بیٹھیے، میم صاحب۔ بھیّا.... آ پَو لوگن....'' تھئی ہاتھ جوڑے ان لوگوں سے بیٹھنے کی درخواست کرر ہا تھا۔

''نہیں، ہم لوگ ٹھیک ہیں۔ بس پھٹا پھٹ کام شروع کردیں۔'' جاوید کی آواز میں

اُکتاہٹ تھی۔

"رِلیکس مسٹر جاوید، اَدر وائز دیئر پرفارمینس وِل بھی ایفیکٹیڈ۔" کملنی نے انگریزی میں سمجھایا تاکہ سیچنی کا پریوار سمجھ نہ سکے اور انٹرویو دیتے وقت کسی قسم کی جھینپ یا ہچکچاہٹ کا مظاہرہ نہ کرے۔

"آپ لوگوں کا انٹرویو لینا چاہتی ہوں میں...." کملنی نے نتھئی کو سمجھانا شروع کیا۔

"ای مڑھی اور بال بچہ چھوڑ کر ہمارے پاس کیا ہے جو آپ کو دیں گے ہم؟" انٹرویو کے معنی سے ناواقف نتھئی نے پہلے ہی کمزور آواز میں صفائی پیش کی تھی۔

جاوید اور کپوریا منہ دبا کر ہنس پڑے تھے۔ کملنی کے چہرے پر بھی ایک ہمدردانہ مسکراہٹ تیر گئی تھی۔

"ہم آپ لوگوں سے کچھ پوچھیں گے۔ آپ اس کا جواب دیں گے۔" کملنی نے واضح کیا۔

"اچھا، ای بات ہے۔" نتھئی کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

"آپ لوگ تیار رہیے۔" کملنی نے کیمرہ مین کو اشارہ کیا۔

"سیچنی کی ماں کو بلائیے۔ پہلے کچھ سوال اُنھیں سے کریں گے۔" کملنی نے نتھئی سے کہا۔

جھونپڑی کے دوسرے سرے پر باہر ہی زمین پر، چھینٹ کی مٹ میلی ساڑی سے اپنا آدھا چہرہ ڈھانکے، چھوٹے بچے کو گود میں لیے کوئی عورت بیٹھی تھی۔ اس کی پیٹھ کملنی کی طرف تھی۔

"اے چھوٹکی کی مائی .... چل ادھر آ ..... میم صاحب بلا رہی ہیں۔" نتھئی نے آواز دی۔

چھوٹی بچی دودھ پی رہی تھی۔ اسے زبردستی خود سے الگ کرتی ہوئی جھٹ سے وہ مڑی۔ اس کے پستان سے دودھ کی ایک لکیر بچے کے ہونٹوں پر دور تک کھنچتی چلی گئی تھی۔ وہ بچی کو زمین پر بٹھاتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔ کملنی نے دیکھا کہ اس عورت کے تن پر ساڑی کے علاوہ دوسرا لباس نہیں تھا۔ پیٹی کوٹ نہ ہونے کی وجہ سے دونوں ٹانگیں ساڑی کے پیچھے سے کسی پرچھائیں کی طرح جھلک رہی تھیں۔ بلاؤز نہیں تھا۔ اس نے ساڑی کے آنچل کو اپنے سینے پر پھیلاتے ہوئے اس

کے نچلے سرے کو اپنے قدرے لٹکے ہوئے سڈول بھرے بھرے پستانوں کے نیچے دبا دیا تھا۔ آنچل کے ایک پھٹے سوراخ میں سے دائیں جانب کے پستان کی چوچی باہر نکل آئی تھی۔

''ایکسائٹنگ پوائنٹ....'' جاوید نے کپوریا کے کان میں پھسپھسا کر کہا۔ اس کے باوجود کملنی نے سن لیا۔

''پرہیپس وی مسٹ بی سوبر۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی کملنی کی آواز میں تلخی گھل گئی تھی۔ جاوید جھینپ گیا تھا۔ پرکلیا آ کر کملنی کے پاس زمین پر بیٹھ گئی تھی۔

''لیں.....کیمرہ.....آن.....لائٹ.....ٹیک....''

''.....آپ کا نام کیا ہے؟''

''.....پرکلیا.....''

''کتنے بچے ہیں؟''

''.....چار۔''

''پڑھنے جاتے ہیں؟''

''نہیں.....''

''کیوں؟''

کملنی کے اس کیوں کے جواب میں پرکلیا نے بھی سوالیہ نگاہیں اوپر اُٹھائی تھیں۔ کملنی نے اپنا سوال دہرایا، ''بچے اسکول کیوں نہیں جاتے؟''

''اب کیا بتائیں.....؟'' پرکلیا ہنس پڑی۔ ایک بے بس، بے جان سی ہنسی۔ چہرے پر آئے ہوئے پسینے کو آنچل سے پونچھتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی، ''کام دھندا میں کون ہاتھ بٹائے گا؟ ایک سوّر ہے اس کو دیکھنا، دعوتوں کے لیے پتّل دونا، کٹیا بِنیا کرنا، اکیلے ہم لوگوں سے سپریگا بہن جی؟ یہ بچے ہی تو ہاتھ بٹاتے ہیں۔ پھر اب بیٹی بھی تو بیاہ جوگ ہوگئی ہے۔''

''کھیتی کتنی ہے؟'' کملنی نے پوچھا۔

پرکلیا طنز سے ہنس پڑی۔ سر جھکاتے ہوئے بتایا، ''کھیتی ہی ہوتی تو کیا بات تھی۔ پاس کھیتی

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

بھر کی زمین نہیں ہے۔ ہے بھی تو بس نام بھر کی۔ آپ سرکار کی آدمی ہو بہن جی، سرکار تک ہماری فریاد سنا دو۔''

پرکلیا نے اپنے دونوں ہاتھ التجا کے انداز میں جوڑ لیے تھے۔

''آپ لوگوں کے لیے سرکار کی طرف سے تو پہلے ہی سہولتیں دی گئی ہیں۔ آپ کی برادری کے کئی لوگ اس کا فائدہ اُٹھا رہے ہیں، آپ لوگ کیوں نہیں لے رہے ہیں؟ پڑھیے، لکھیے، نوکری کریے۔'' کملنی نے سمجھایا۔

''ہوگا بہن جی۔ جس کے چولھانی کا منہ دیکھنے کی نوبت ہوگی وہ اسکول کا بھی منہ دیکھے گا۔ اِہاں تو لڑِکا بچہ سب ہاتھ پیر نہ چلاویں تو منہ نہ ڈولے۔ ایکَو لڑِکا آپ ہماری برادری کا کہیں کسی دفتر میں نوکری میں دیکھو ہو بہن جی؟ اگر ایسا کوئی لڑِکا آپ کی نجر میں ہو بہن جی تو ضرور بتانا۔ ہماری سیچنی بھی بیاہ جوگ ہوگئی ہے۔'' پرکلیا اپنی آنکھیں میچ کر کچھ سوچتے ہوئے بولی، ''سرکار بھی تو اسی کو سہولیت دیوے ہے جس میں بڑھ کر لیوے کی کوبت ہے۔ ہم لوگوں کی دَشا تو اؤ پنروا کی طرح ہے لنگڑی۔'' پرکلیا نے جھونپڑی کے کونے میں ایک بچے کی طرف اشارہ کیا جو بڑی بے بسی اور حیرت سے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔

پھر کملنی نے دیکھا کہ وہ بچہ کسی طرح گھسٹ کر ماں کے پاس آنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''کیا ہوا تھا اسے؟'' کملنی نے پوچھا۔

''پچھلے سال ہم لوگ کھیت میں آلؤ بیننے گئے تھے۔ مُردار کھیل کھیل میں گڈھا بنا کر اس میں اپنا دونوں پیر ڈال دیا اور اوپر سے مٹی پاٹ کر سیچنی سے بولا کہ میرا ہاتھ پکڑ کر پیچھے کی طرف کھینچ۔ اس نے نہ جانے کیسے کھینچا کہ اس کے دونوں پیر گھٹنے سے نیچے جھول گئے۔ اب دن رات اس کی بھی ٹہل کرنی ہے ہمیں۔'' پرکلیا کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اس نے آنچل سے آنکھوں کو صاف کیا۔

''گھر کا خرچ کیسے چلتا ہے؟ کیا کام کرتے ہیں آپ لوگ؟'' کملنی کا اگلا سوال کیمرے میں قید ہوا تھا اور فوراً ہی کیمرے کا رُخ پرکلیا کی طرف ہوگیا تھا، اس کا جواب پانے کے لیے۔

پرکلیا اپنے خاندان کے پیشے کی پوری فہرست بیان کر رہی تھی ——

''دھان، گیہوں کٹ جانے کے بعد لوگوں کے خالی کھیتوں میں جو اناج پڑا رہتا ہے اسے ہم لوگ کوُچی سے بٹور کر لے آتے ہیں۔ کسی کسی فصل میں تو ایک آدھ من اناج مل جاتا ہے۔''

''اور جب کسی فصل کا موسم نہیں رہتا تب....؟'' کملنی کا تجسّس بڑھ رہا تھا۔

''تو گڑھئی، پوکھرا سے مچھلی، ڈوڑ ہا، گھونگا، میگھا ویگھا پکڑ لیتے ہیں۔ اسی سے پیٹ بھرتا ہے۔''

کملنی کو محسوس ہوا جیسے اس کی انتڑیاں اُبکائی کے ساتھ باہر آ جائیں گی۔ خود کو کسی طرح سنبھالا اور موڈ بدلنے کے لیے دوسری طرف نگاہ دوڑائی۔ سامنے ہی زمین پر ایک پھٹی لنگی کے اوپر گوبر کو پتلا کر کے پھیلایا گیا تھا۔

''فوکس.... دیٹ سائڈ....''

کملنی نے کیمرہ مین کو اشارہ کیا اور پرکلیا سے پوچھ بیٹھی۔

''یہ گوبر کیوں پھیلایا ہے آپ نے؟''

''سکھانے کے لیے۔''

''کیا کریں گی اس کا؟''

''اس میں سے گیہوں نکالنا ہے۔''

''اس میں سے گیہوں....؟'' کملنی بری طرح چونکی تھی۔

''ہاں بہن جی۔ اب تو بہُرا ہر جگہ مشین سے دوائی ہونے لگی۔ نہیں تو پہلے اس سے بھی ہم لوگ مزے کا اناج نکال لیتے تھے۔''

''کیسے؟'' کملنی حیرت سے پوچھ رہی تھی۔

پرکلیا نے سمجھایا، ''پہلے گیہوں، دھان کی پیَر بیلوں سے دنوائی جاتی تھی نا.....تو بیل اناج کھاتے رہتے تھے..... پر وہ ان کو ہضم نہیں ہوتا تھا۔ بچارے گھاس بھوسا کھانے والے اناج کیا

ہضم کریں گے۔ سو پورا اناج کھڑا کھڑا ہی ان کے گوبر میں نکل آتا تھا۔ اس کو سکھا کر، پیٹ کر، دھو کر ہم لوگ اپنے کام میں لاتے ہیں۔''

کملنی کا سر گھومنے لگا تھا۔ اُف! زندگی کا ایسا المیہ۔

پرکلیا بتا رہی تھی، ''کبھی کبھی تو گوبر اُٹھانے کے سوال پر ہماری برادری کے لوگ آپس میں جھگڑ جاتے ہیں۔''

کملنی کو گویا کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ اپنے آپ سے بدبدا رہی تھی —— ''ٹھہرو، ابھی ٹھہرو اکیسویں صدی۔ پرانی صدی کی شام کا وقت ہے اور شام کے آنگن میں دور اُفق پر دھرتی اور آکاش کا ملن بھرم ہی سہی، وہ بھرم بھی تو پورا ہونے دو۔ ٹھہرو، ابھی ٹھہرو اندھی صدی!''

* * *

بوئے آدم

''اچھا، تم لوگوں کے یہاں سگائی اور بیاہ میں کیا فرق ہوتا ہے؟''

چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے مکتا نے پرت پیا سے پوچھا۔ پرت پِیا، مکتی کی کرسی کے پاس ہی زمین پر بیٹھ گئی تھی۔ اپنا چائے کا پیالہ نیچے رکھ کر اس نے اپنے آنچل کو منہ کے سامنے کرلیا۔ جب بھی اسے کچھ بولنا ہوتا وہ آنچل کو اپنے منہ کے سامنے کرلیتی۔ شاید یہ عادت بچپن ہی سے ہے یا ممکن ہے کہ قدرے باہر نکلے ہوئے دانتوں کو چھپانے کی کوشش میں یہ عادت پڑ گئی ہو۔ دوسرے کام کرتے ہوئے وہ بالکل نارمل رہتی ہے۔ بس، بولتے اور ہنستے وقت وہ آنچل سے اپنے منہ کو چھپانے کی کوشش کرتی ہے۔ شاید اُس اَن پڑھ کو بھی یہ معلوم تھا کہ ان دونوں کاموں کے وقت سامنے والے کا دھیان بڑی باریکی سے ماتھے، بھوؤں کے بیچ سے سرک کر ناک سے ہوتا ہوا ہونٹوں کی حرکات پر مرکوز ہوجاتا ہے۔

''وہ ایسا ہوتا ہے نا میم ساب ....''

''پھر میم ..... میں کتنی بار سمجھاؤں تجھے کہ میں میم ویم نہیں، خالص ہندوستانی ہوں، ہندوستانی۔ دیدی کہو، بھابھی کہو، چاچی کہو، بوا کہو .... ہمارے یہاں رشتوں کی کمی ہے کیا جو میم سے کام چلائیں۔''

ہندوستانی ہونے کی انا کی کچھ بوندیں مکتا نے یوں پرت پِیا کے اوپر بھی چھلکا دیں جیسے